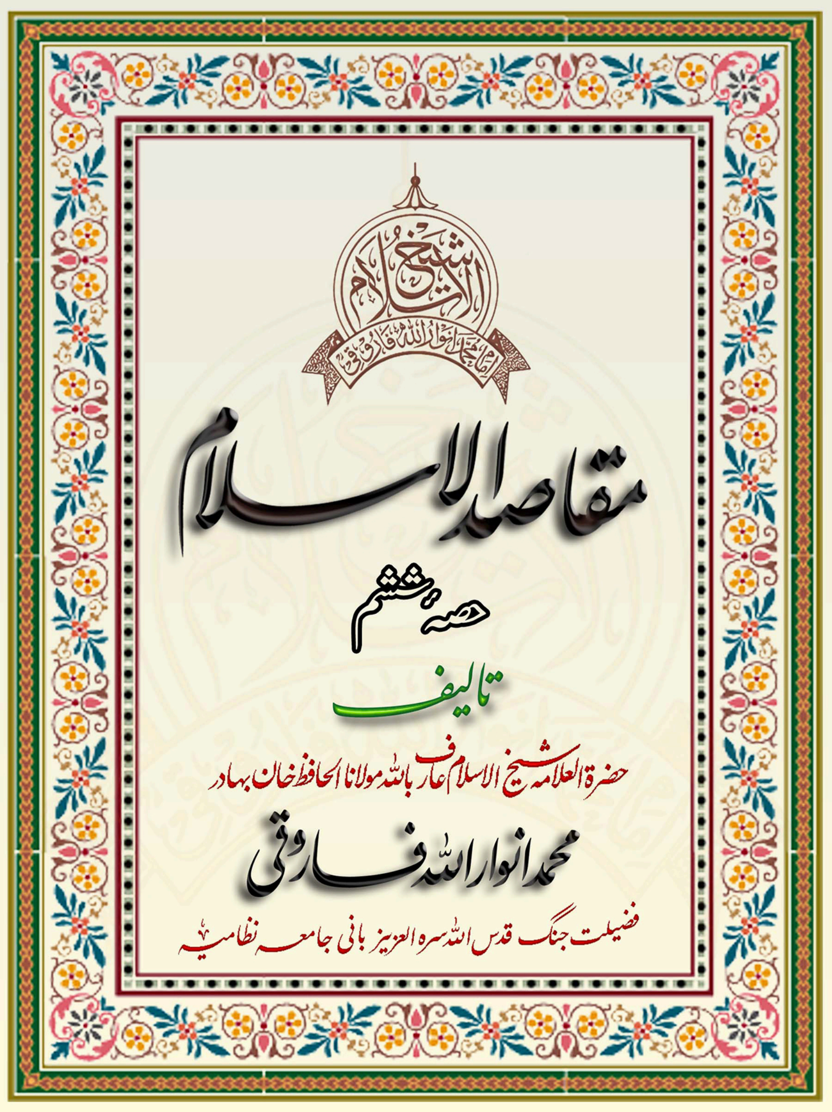

شیخ الاسلام
امام محمد انوار اللہ فاروقی
مقاصد الاسلام
حصہ ششم
تالیف
حضرۃ العلامہ شیخ الاسلام عارف باللہ مولانا الحافظ خان بہادر
محمد انوار اللہ فاروقی
فضیلت جنگ قدس اللہ سرہ العزیز بانی جامعہ نظامیہ

ان الدين عند الله الاسلام

ازافادات حقائق آگاہ معارف دستگاہ استاذالاعلام شیخ الاسلام

حضرت مولانا حافظ محمد انواراللہ فاروقی علیہ الرحمۃ بانی جامعہ نظامیہ



مقاصدالاسلام

حصہ ششم

ناشر

مجلس اشاعت العلوم جامعہ نظامیہ حیدرآباد۔ الہند

بار چہارم	:	منجانب مجلس اشاعت العلوم جامعہ نظامیہ حیدرآباد۔ الہند
تاریخ	:	
قیمت	:	۸۰ روپئے (اسّی روپئے)
تعداد	:	ایک ہزار (۱۰۰۰)
طباعت	:	انوار گرافکس، Ph: 9390045494
ناشر	:	مجلس اشاعت العلوم جامعہ نظامیہ حیدرآباد

فون: 24576772 / 24416847۔ فیاکس: 24503267

ویب سائٹ: www.jamianizamia.org

ای میل: fatwa@jamianizamia.org

الحمدالله رب العالمین والصلوة والسلام علی سید نا محمد وعلی آله و صحبه اجمعین. امابعد.

دیباچہ

مقاصد الاسلام حصہ پنجم کے اختتام میں عبداللہ بن سبا کا ذکر چھڑ گیا تھا اور ہم نے وعدہ کیا تھا کہ حصہ ششم میں اس کے مفصل حالات بیان کریں گے' لہذا ہم اس حصہ کو ابن سبا کے حالات سے شروع کرتے ہیں۔

عبداللہ بن سبا کے حالات

تاریخ کامل جلد سوم (صفحہ ۵۹) میں لکھا ہے کہ عبداللہ بن سبا یہودی تھا' عثمانؓ کی خلافت میں اسلام ظاہر کر کے حجاز، بصرہ، کوفہ اور شام کا سفر اس غرض سے کیا کہ لوگوں کو گمراہ کرے مگر اس کا مکر کہیں نہ چل سکا۔ آخر مصر گیا اور وہاں کے لوگوں سے موافقت پیدا کی۔ ایک روز بر سبیل تذکرہ کمال تعجب سے کیا: کیا بات ہے کہ عیسی علیہ السلام کے دوبارہ آنے کی تصدیق لوگ فوراً کر لیتے ہیں اور اگر کوئی ان سے کہے کہ محمد ﷺ دوبارہ تشریف لائیں گے تو کوئی نہیں مانتا بلکہ تکذیب کرتے ہیں حالانکہ محمد ﷺ کا مرتبہ عیسی علیہ السلام سے بدر جہا بڑھا ہوا ہے۔ جاہل کیا جانیں کہ احادیث میں کیا وارد ہے۔ یہ موٹی بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور قائل ہو گئے کہ بیشک محمد ﷺ پھر دنیا میں تشریف لائیں گے۔ جب دیکھا کہ سادہ لوح قابو میں آ گئے تو ان سے کہا کہ دیکھو ہر نبی کا ایک وصی ہوا کرتا ہے اور علی

کرم اللہ وجہہ، محمد ﷺ کے وصی ہیں۔ اب خیال کرو کہ جو شخص نبی کی وصیت کو جاری نہ ہونے دے اور وصی کو مغلوب کرے، کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظالم ہو سکتا ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ عثمان رضی اللہ عنہ حکومت کر رہے ہیں اور علی وصی رسول اللہ ﷺ کی کچھ بھی نہیں چلتی۔ چونکہ وہ اعلیٰ درجہ کا لکچرار تھا، اپنی سحر بیانی سے ہر ایک بات پوری طور پر ذہن نشین کر دی کہ عثمانؓ غاصب ہیں اور خلافت علی کرم اللہ وجہہ کا ہی حق ہے جب اس کو بھی لوگوں نے مان لیا تو ان سے کہا کہ وصی رسول اللہ ﷺ کا حق دلانا۔ دین کی حمایت اور خدا اور رسول کی خوشنودی کا باعث ہے۔ چونکہ یہ ایک سلطنت کا مقابلہ تھا لوگ حیران ہوئے کہ یہ انقلاب عظیم چند آفاقیوں سے کیونکر ہو سکے؟ کہا تدبیر یہ ہے کہ ہر ایک شہر میں لوگ بھیجے جائیں اور پہلا کام ان کا یہ ہو کہ جو حکام عثمانؓ کی طرف سے مقرر ہیں ان کی کارروائیوں میں نکتہ چینی اور حرف گیری کریں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر زور دیں، جس سے لوگوں کا میلان ہماری جماعت کی طرف ہو جائے۔ پھر یہ کریں کہ ہر ایک شہر میں جو لوگ جاتے ہیں وہاں کے حکام کی شکایت دوسرے شہروں کے لوگوں کو لکھیں اور اچھی طرح اس کی اشاعت کریں۔ چنانچہ ایک جماعت اس کام پر مامور ہوئی اور بڑے بڑے شہروں میں لوگ روانہ کئے گئے اور کارروائیاں شروع ہو گئیں۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سبا نے جو بڑے بڑے شہروں میں دورہ لگایا تھا اس سے بڑی غرض اس کی یہ تھی کہ ہر شہر میں اپنے ہم خیالوں کی ایک ایک کمیٹی قائم کر دے۔ چونکہ یہودی ہر ملک میں موجود تھے، جن کا مقصود اصلی اسلام کو ضرور پہونچانا تھا اس

کے ساتھ موافقت کر کے مسلمانوں میں شریک ہوگئے اور نہایت خوشی سے ایک ایک کمیٹی بنالی اوراس کا تعلق مصر کی صدر کمیٹی سے کیا گیا۔اسی وجہ سے جو جماعت ہر ہر شہر کوروانہ کی گئی نہایت آسانی سے کامیاب ہوتی گئی۔غرض کہ ہر ایک شہر میں دوسرے شہروں کے حکام کی شکایتیں اور مظالم نہایت سرعت سے شائع کئے گئے۔جس شہر میں یہ خبریں پہنچتیں وہاں کے لوگ کہتے: الحمدللہ ہم بڑی عافیت میں ہیں۔اہل مدینہ کے پاس جب ہر ایک شہر کے حکام کی ظلم وزیادتی کی شکایتیں پہونچیں اور عثمانؓ سے لوگوں نے بیان کیا تو آپ نے تفتیش حال کے لئے ہر ایک شہر کو لوگ روانہ کئے اور ثابت ہوا کہ وہ سب شکایتیں بے اصل محض ہیں۔مگراس جماعت فتنہ انگیز کی کوشش اور جانفشانی کا یہ اثر ہوا کہ تخمیناً ایک ہزار اور بروایت ناسخ التواریخ دو ہزار کا لشکر مصر سے اوراسی قدر بصرہ سے اوراسی قدر کوفہ سے مدینہ منورہ کوروانہ ہوا اور یہ تینوں لشکر مدینہ طیبہ میں جمع ہوئے۔لشکر مصر، ذی المروہ میں اور لشکر کوفہ' اعوص میں اور لشکر بصرہ' ذی اخشب میں فروکش ہوا۔مصریوں کی خواہش تھی کہ عثمانؓ کو معزول کر کے علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ بنائیں اور اہل بصرہ کا میلان طلحہؓ کی طرف تھا اور اہل کوفہ کا میلان زبیرؓ کی طرف۔

قاتلین عثمانؓ پر لعنت:

اہل مصر نے جب علی کرم اللہ وجہہ کے پاس آکر اپنا مقصود ظاہر کیا تو آپ نے ان کو سخت جھڑکی دی اور فرمایا کہ سب صالحین جانتے ہیں کہ لشکر ذی مروہ' لشکر ذی اخشب اور لشکر اعوص پر نبی کریم ﷺ نے لعنت کی ہے۔اسی طرح بصرہ والے طلحہؓ کے پاس جب

گئے تو انہوں نے بھی یہی فرمایا اور کوفہ والوں کو زبیرؓ نے بھی یہی کہا۔ ہر چند ان حضرات نے آنحضرت ﷺ کی پیشگوئی اور ان لشکروں پر لعنت کرنے کا حال ان کو سنا دیا مگر شقاوت کا کون علاج کر سکے آخر سب نے مل کر عثمانؓ کو شہید کر ڈالا۔ انتہی ملخصا۔

یہ واقعہ ناسخ التواریخ صفحہ ۵۲۴ میں بھی لکھا ہے مگر چونکہ یہ کتاب ان واقعات میں مذہبی رنگ کی ہے اس لئے اس لشکر کی خرابی اور ملعون ہونے کا حال جو علی کرم اللہ وجہہ وغیرہ نے بیان کیا اس کو ہم نے قلم انداز کر دیا۔ بہر حال باتفاق حضرات شیعہ وسنی یہ تو ثابت ہے کہ ابن سبا یہودی تھا' جس پر اہل بیت نے لعنت کی اور علی کرم اللہ وجہہ نے اس کے جلانے کا حکم فرمایا تھا' اس نے فتنہ انگیزی کر کے عثمانؓ کو شہید کروایا جس سے فتنوں کا دروازہ کھل گیا۔ اور ایک سے دوسرا فتنہ پیدا ہوتا گیا۔

شہادت عثمانؓ کی پیشنگوئی:

عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ اسلام میں نہایت پرخطر سمجھا جاتا تھا' چنانچہ مشکوۃ شریف کی کتاب الفتن میں روایت ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ عمرؓ نے حذیفہؓ سے پوچھا کہ آنحضرت ﷺ نے جس خطرناک موج زن فتنہ کی خبر دی ہے' کیا وہ تمہیں معلوم ہے؟ کہا ہاں' مگر آپ کو اس سے کوئی تعلق نہیں' آپ کے اور اس کے بیچ میں ایک دروازہ ہے جو بند ہے' فرمایا کیا وہ دروازہ کھولا جائے گا یا توڑا جائیگا؟ کہا توڑا جائیگا اور پھر کبھی بند نہ ہوگا۔ انتہی ملخصًا۔ مطلب یہ کہ لوگ خلیفۂ وقت کو شہید کریں گے جس سے دروازہ فتنہ کا کھل جائیگا۔ اور ہمیشہ مسلمانوں میں فتنے برپا ہوا کریں گے۔

علیؓ عثمانؓ کو امام برحق جانتا:

چنانچہ نہج البلاغہ صفحہ ۱۵۹ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جو تقریر عثمانؓ سے کی ہے اس سے بھی یہی ثابت ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ’’**و انی انشدک اللہ ان لاتکون امام ھذہ الامۃ المقتول فانہ کان بقال یقتل فی ھذہ الامۃ امام و یفتح علیھا القتل والقتال الی یوم القیامۃ**‘‘ یعنی میں آپ کو خدا کی قسم دیتا ہوں کہ کہیں آپ اس امت کے وہ امام نہ بنیں جو قتل کیا جائیگا کیونکہ یہ بات قدیم سے کہی جاتی ہے کہ اس امت میں ایک امام قتل کیا جائیگا اور اس سے باہمی قتل وقتال کا دروازہ کھل جائیگا۔ اور قیامت تک مقاتلہ جاری رہیگا۔ انتہی۔ یہی روایت ناسخ التواریخ کی جلد دوم صفحہ ۵۱۲ میں بھی موجود ہے۔

علیؓ کو عثمانؓ کے قتل کا خوف:

دیکھئے علی کرم اللہ وجہہ کو بھی اس فتنہ کا خوف لگا ہوا تھا اور یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اگر عثمان رضی اللہ عنہ قتل کئے جائیں تو مسلمانوں میں باہمی جنگ وجدال شروع ہو جائیگا۔

خصائص کبری کی جلد دوم صفحہ ۱۲۴ میں یہ روایت ہے کہ جب عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کیا گیا آپ بالاخانہ پر برآمد ہوئے اور باغیوں سے فرمایا: دیکھو اگر مجھے قتل کروگے تو پھر تم سے یہ نہ ہو سکے گا کہ سب مل کر نماز پڑھیں اور نہ اتفاق سے جہاد کر سکو گے اور نہ غنیمت تم میں تقسیم ہوگی۔ جب انہوں نے نہ مانا تو آپ نے ان پر بد دعا کی۔ ان تصریحات سے ثابت ہے کہ یہ فتنہ جس میں عثمانؓ کی شہادت ہوئی نہایت خطرناک تھا جس

سے اور فتنوں کا دروازہ کھل گیا اور نیم فریقین کی کتابوں سے ثابت ہے کہ اس کا بانی مبانی ابن سبا تھا جس کے یہودی ہونے میں کسی کو شبہ نہیں۔

مسئلۂ وصی سے فتنہ کی ابتداء:

اور یہ بھی فریقین کی کتابوں سے ثابت ہو گیا ہے کہ اس فتنہ کی ابتداء مسئلہ وصی اور خلافت بلافصل سے ہوئی، ہر چند یہ مسئلہ علی کرم اللہ وجہہ کے مفید تھا، مگر بجائے اس کے کہ آپ کو اس سے نفع حاصل ہوتا سخت صدمہ پہونچا اور اس کا برا اثر پہلے پہل آپ ہی کی خلافت پر پڑا۔ اس سے بھی ثابت ہے کہ خلفاء ثلاثہ کے وقت میں ۳۴ ہجری تک کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ اس مسئلہ کو خلافت سے تعلق ہے۔ صرف اس یہودی نے اس سال یہ مسئلہ عوام الناس کے ذہن نشین کر کے یہ فتنہ برپا کیا۔

وقائع متعلقہ قتل عثمانؓ:

اب اس سے متعلق تھوڑے سے اور واقعات بھی سن لیجئے یہ واقعہ اسلام میں عجیب جاں گداز اور رول گداز ہے۔ تاریخ کامل کی جلد سوم صفحہ ۶۷ میں لکھا ہے کہ عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ چالیس روز رہا اور اٹھارہ روز کے بعد تو یہ نوبت پہونچی کہ کھانا، پانی آپ کا بند کر دیا گیا، کسی کی طاقت نہ تھی کہ باہر سے کوئی چیز اندر لے جا سکے۔ ایک روز آپ نے اپنے بالاخانہ پر چڑھکر صحابہ سے پوچھا کیا آپ لوگ جانتے ہو کہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ طیبہ میں تشریف لائے تو میٹھے پانی کی سخت تکلیف تھی، میں نے اپنے روپیہ سے بئر رومہ کو خریدا جو میٹھے پانی کا کنواں تھا اور مسلمانوں کا ڈول اس میں ڈلوایا، سب نے تصدیق کی، پھر

فرمایااب میری یہ حالت ہے کہ میٹھے پانی کو میں اور میرے عیال واطفال ترس رہے ہیں۔

لاش عثمانؓ کی توہین:

ناسخ التواریخ کی جلد دوم صفحہ ۵۳۸ میں لکھا ہے کہ عثمانؓ کے قتل ہونے کے بعد عمیر نے لاش مبارک کو اس زور سے ٹھوکر ماری کہ دو پھلسیاں ٹوٹ گئیں۔اورلوگوں نے آپ کا گھر لوٹ ڈالا۔اس کے بعد عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ اور ایک شخص تجہیز و تکفین کی غرض سے آپ کے گھر گئے‘ دیکھا کہ باغیوں کی جماعت دروازہ پر کھڑی ہے کسی کو اندر جانے نہیں دیتی‘ تین روز تک آپ کی لاش کو دفن کرنے نہیں دیا اور اس قدر ذلیل کیا کہ ایک پاؤں آپ کا کتے کھا گئے‘ تین روز کے بعد علی کرم اللہ وجہہ کی سفارش پر لاش کو دفن کرنے کی اجازت ملی پھر جنازہ کی یہ توہین کہ معمولی تختہ بھی نصیب نہ ہوا۔کسی چیز پر ڈال کر لے جا رہے تھے جس سے ایک پاؤں جو باقی تھا لٹک رہا تھا اور جنازہ کو سنگسار کرتے جاتے تھے۔ جب اس حالت میں جنازہ بقیع میں پہونچا تو کہا گیا یہ شخص مسلمان نہ تھا‘ مسلمانوں کے قبرستان میں ہم اسے دفن کرنے نہ دیں گے۔آخر اس مقام میں جو یہودیوں کے قبرستان کے بازو تھا‘ بغیر غسل و کفن اور نماز جنازہ کے آپ کی لاش دفن کردی گئی۔انتہی ملخصا۔

فضائل عثمانؓ

اب غور کیجئے کہ عثمانؓ کوئی معمولی شخص نہ تھے‘ ان کو اسلام میں اعلیٰ درجہ کی وجاہت حاصل تھی۔ رقیہؓ کے انتقال کے بعد ایک روز آنحضرت ﷺ کا گذر حضرت عثمانؓ پر ہوا دیکھا کہ وہ رو رہے ہیں‘ سبب دریافت فرمایا‘ عرض کی کہ اس سے بڑھ کر کیا مصیبت ہو کہ

قرابت مصاہرت آپ سے منقطع ہوگئی‘ فرمایا مت رو۔ اگر میری سولڑکیاں ہوتیں اور یکے بعد دیگر مرتی جاتیں تو میں ایک ایک تمہارے نکاح میں دیتا جاتا‘ یہاں تک کہ سو پوری ہو جاتیں۔ ابھی جبرئیل میرے پاس آئے اور کہا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ام کلثوم کو تمہارے نکاح میں دوں۔

علی کرم اللہ وجہہ سے لوگوں نے عثمانؓ کا حال دریافت کیا‘ فرمایا: وہ وہ شخص ہیں کہ ملأ اعلی کے فرشتے ان کو ذی النورین کہتے ہیں یعنی نبی کریم ﷺ کے وہ داماد ہیں جن کے ساتھ آپ کی دو صاحبزادیوں کا نکاح ہوا۔

عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے گھروں میں متواتر چار روز کا فاقہ ہوا‘ جب عثمانؓ کو خبر ہوئی تو کئی بوجھ آٹے‘ گیہوں اور کھجور کے اور تین سو درہم فوراً روانہ کر دیئے۔ یہ روایت مفصلاً اوپر مذکور ہوئی۔ ایک بار کئی روز غلہ مدینہ منورہ میں باہر سے نہ آیا اور یہاں تک نوبت پہونچی کہ صحابہ آنحضرت ﷺ سے بھوک کی شکایت کرنے لگے جس سے منافق خوش ہوتے تھے۔ آخر عثمانؓ غلہ کی تلاش میں نکلے اتفاقاً بقیع کی جانب غلہ کے اونٹ آ رہے تھے۔ پندرہ اونٹ غلہ سے لدے ہوئے آپ نے خریدے اور ان میں سے بارہ اونٹ حضرت کی خدمت میں حاضر کئے۔ حضرت نہایت خوشی سے دونوں ہاتھ اس قدر اونچے کئے کہ بغلوں کی بیاض نظر آنے لگی۔ ابو مسعودؓ کہتے ہیں کہ اس وقت عثمانؓ کے لئے جو دعائیں حضرت نے کیں کسی کے لئے کرتے ہوئے میں نے نہیں سنیں۔

علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جو شخص بازو کا گھر خرید

کر کے مسجد نبوی میں شامل کرے اس کو خدائے تعالیٰ بخش دے گا۔عثمانؓ نے وہ گھر خرید کر کے مسجد میں شریک کر دیا۔ پھر ایک بار حضرت نے فرمایا جو شخص فلاں قبیلہ کا مربد یعنی کھجوریں اور غلہ سکھانے کی جگہ خرید کر کے مسلمانوں پر صدقہ کر دے اس کو خدائے تعالیٰ بخش دے گا' عثمانؓ نے اس کو خرید کر کے مسلمانوں پر صدقہ کر دیا۔ پھر ایک بار حضرت نے فرمایا جو شخص جیش عسرت کا سامان کر دے خدائے تعالیٰ اس کو بخش دے گا' عثمانؓ نے کل لشکر کا پورا سامان کر دیا یہاں تک کہ اس میں ایک عقال بھی کم نہ تھی۔

جب آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے وہاں کا پانی کھارا اور خراب تھا' صرف بئر رومہ کا پانی میٹھا تھا جس کی ایک مشک ایک مد غلہ کے عوض میں دی جاتی تھی' حضرت نے اس کے مالک سے فرمایا کہ جنت کے ایک چشمہ کے عوض میں وہ کنواں بیچ دو' چونکہ وہ غریب اور کثیر العیال شخص تھا' راضی نہ ہوا' عثمانؓ نے ۳۵ ہزار درہم دے کر وہ کنواں خریدا اور مسلمانوں پر وقف کر دیا۔

ایک بار گرانی کی وجہ سے مسلمانوں کو فاقہ کشی کی نوبت پہونچی' عثمانؓ نے بہت سا آٹا اور گھی اور شہد خرید کر سب مسلمانوں کو کھلایا۔

ایک بار مدینہ منورہ میں قحط ہوا نصارائے عرب نے ہرقل کو لکھا کہ یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں' ان دنوں تباہی میں ہیں کیونکہ مسلمانوں کے مال ہلاک ہو گئے' اگر تم کو اپنے دین کی پاسداری ہے اور مدد کرنا چاہتے ہو تو یہی موقع ہے، اس نے چالیس ہزار کا لشکر تیار کر کے نبی ﷺ کے مقابلہ کے لئے روانہ کر دیا' اور یہ خبر آنحضرت ﷺ کو پہونچی

تو آپ نے اطراف میں نامے لکھے اور ہر روز منبر پر تشریف رکھتے اور دعا میں کہتے کہ الٰہی اگر یہ چند مسلمان ہلاک ہو جائیں تو دنیا میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ رہے گا' مسلمانوں کی مالی حالت اس وقت ابتر تھی' عثمانؓ نے شام سے غلہ لانے کے لئے تجارتی قافلہ تیار کیا تھا' اسلامی ضرورت کو دیکھ کر عرض کی: یارسول! دوسو (۲۰۰) اونٹ مع پالان وغیرہ سامان اور دوسو (۲۰۰) اوقیئے میں گذرانتا ہوں' آنحضرت ﷺ نے الحمدللہ کہکر تکبیر کہی اور سب مسلمان اتنے خوش ہوئے کہ ہر طرف سے تکبیر کے نعرے بلند ہوئے' پھر دوسرے روز آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو صدقہ کی رغبت دی' عثمانؓ اٹھ کھڑے ہوئے اور عرض کی: یارسول اللہؐ اور دوسو (۲۰۰) اونٹ اور دوسو (۲۰۰) اوقیے گذرانتا ہوں' اس پر ہر طرف سے تکبیر کے نعرے بلند ہوئے' اسی طرح متفرق مجلسوں میں نوسو پچاس اور بعض روایتوں میں نوسوستر (۹۷۰) اونٹنیاں اور تیں گھوڑے اور سات سو (۷۰۰) اوقیئے سونا اور دس ہزار (۱۰٫۰۰۰) دینار حضرت کے روبرو ڈالے گئے آپ ان کو نہایت خوشی سے نیچے اوپر کرتے اور یہ فراتے جاتے تھے کہ اے عثمان! خدا نے تمہارے ہر قسم کے گناہ خواہ چھپے ہوں یا ظاہر' آئندہ ہونے والے سب کی مغفرت کر دی پھر فرمایا کہ اس کے بعد عثمانؓ جو چاہیں کریں کچھ پروا نہیں کوئی امران کو ضرر نہ دے گا۔

یہ سب روایتیں ''کنز العمال'' کی کتاب الفضائل میں مذکور ہیں اور ان کے سوا بہت سے فضائل ہیں جن کا دکر موجب تطویل ہے۔ ان روایتوں سے ثابت ہے کہ آپ نہایت فیاض اور اسلام اور مسلمانوں کے نہایت خیر خواہ تھے۔ اسی فیاضی نے آپ کو شارع علیہ

الصلوٰۃ والسلام کی اجازت دلوادی کہ آئندہ جو چاہیں کریں کوئی بات قابل مواخذہ نہ ہوگی۔

عثمانؓ کی فیاضیاں اوراحسانات:

اب غور کیجئے کہ جب آپ کی ذاتی محدود آمدنی پر یہ بخشش ہوتو ملک شام‘ عراق اور مصر وغیرہ ممالک اسلامیہ کا خراج آپ کے روبروآتا ہوگا تو کس قدر بے باکانہ آپ کی بخششیں ہوتی ہوں گی۔ یہی وجہ تھی کہ عموماً اہل اسلام آپ کی خلافت میں نہایت مرفہ الحال ہوگئے تھے۔جس کا حال ابھی معلوم ہوا۔

’’تاریخ اسلام‘‘ میں لکھاہیکہ باوجوداس دولت وخلافت کےآپ کے مزاج میں اتنی انکساری تھی کہ کبھی کبھی مسجد ہی میں سورہتے‘ لوگوں کواچھے اچھے کھانے کھلاتے اورخود روٹی اورسرکہ پرقناعت کرتے تھے۔

’’تاریخ الخلفاء‘‘میں لکھاہے کہ جب ملک خراساں اورنیشاپوراورسرخس اورمرواور بیہق وغیرہ سیر حاصل ملک آپ کے وقت میں فتح ہوئے اور مال بکثرت ہرطرف سے آنے لگاتو آپ کی سخاوت یہاں تک پہونچی کہ لاکھ بدرے تک دیئے جس میں ہر بدرہ چار ہزاراوقیہ کاتھا۔

اب دیکھئے کہ جب آپ کی فیاضیاں اس حدتک پہونچی تھیں کہ نبی ﷺ نے ان کے صلہ میں فرمادیا تھا‘ جیسا کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہےتو صرف آنحضرتﷺ کا یہی ایک ارشادان کے محبوب قلوب ہونے کیلیئے کافی و وافی تھا‘ علاوہ اس کے تشنگان آب شیریں جوتقریباً کل صحابہ تھےان کو ہمیشہ کے لئے سیراب کرنااوربحسب ضرورت ان کوعمدہ

عمدہ کھانے کھلانا وغیرہ احسانات کس قدر ممنونیت کے باعث ہوئے ہوں گے۔ پھر بارہ سال کی مدت خلافت میں ان فیاضیوں نے جن سے ہر قریب ب بعید برابر مستفید تھا کس قدر مسلمانوں کو ممنون احسان بنایا ہوگا۔ چونکہ یہ مسلم ہے کہ (**الانسان عبید الاحسان**) تو ایسے محسن کے مقتول ہونے کا کس قدر صدمہ ان پر ہوا ہوگا' اور قتل بھی کیسا کہ جس میں ذلت کی انتہا ہوگئ' اس سے زیادہ کیا ہو کہ کتوں نے ایک پاؤں کھالیا' جنازہ سنگسار کیا گیا، جنازہ کی نماز تک پڑھنے نہ دی' مسلمانوں کے مقبرہ میں دفن ہونے نہ دیا۔ ایسے محسن کی یہ حالت ہو تو کہئے کہ اہل اسلام جو آپ کے جود و نوال سے مدتوں فیضیاب رہے ان کی کیا حالت ہونی چاہئے۔ یہی اسباب تھے جنہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں انتہا کا جوش پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ ناسخ التواریخ کی جلد سوم کے صفحہ ۱۴۱ میں لکھا ہے کہ جب شہر حبیل کو باور کرایا گیا کہ علی کرم اللہ وجہ عثمانؓ کے قاتل ہیں۔ تو علی الصباح معاویہؓ کے پاس آئے اور کہا:
''تو خلیفہ عثمانی و عامل او و پسر عم اوئی و ما از جملہ مومنا نیم و دست ماربین بیعت عثمان است اگر انمردی کہ بعلی ابوطالب و کشند گان عثمان قتال توانی کرد و خون عثمان را توانی جست حکم تو بر ما روان است و پذیرائی فرمان تو بر ما واجب و گرنہ ترا از عمل باز داریم و این امارت با دیگرے گذاریم و در خدمت او بعلی جہاد کنیم چندانکہ خون عثمان را بجوئیم و گرنہ جاں بر سرایں کار بذل کنیم'' انتہی۔

دیکھئے کس قدر جوش ان کی اس تقریر سے ٹپک رہا ہے!! یہاں تک مستعد ہیں کہ اگر معاویہؓ جنگ میں سستی کریں تو ان کو معزول کر کے دوسرے شخص کو حاکم مقرر کر لیں۔ جو

پوری طرح سے خلیفۂ مظلوم کے خون کا بدلہ لے سکے۔ ان کو اس معاملہ میں مسلمانوں پر بھروسہ اور اطمینان تھا کہ وہ سلطنتوں کا مقابلہ ان کو آسان نظر آیا۔

علیؓ کا شیعہ کے بدلے اہل شام کو قبول کرنے کی آرزو کرنا:

ان لوگوں کے جوش کا حال اس روایت سے بھی معلوم ہوسکتا ہے جو نہج البلاغہ کی جلد اول صفحہ ۹۲ میں لکھی ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں ''ابها الشاهدة أبدانهم، الغائبة عقولهم، المختلفة أهواء هم، المبتلى بهم أمرائهم، صاحبكم يطيع الله و انتم تعصونه، و صاحب أهل الشام يعصى الله وهم يطيعونه، لو ددت والله أن معاوية صارفنى بكم صرف الدنيار بالدرهم فاخذ منى عشرة منكم و أعطانى رجلا منهم، انتهى ''یعنی اے لوگو! تم وہ ہو کہ تمہارے اجسام تو حاضر ہیں مگر عقلیں غائب، تمہاری خواہشیں مختلف ہیں، تمہارے امراء تمہاری وجہ سے آفتوں میں مبتلاء ہیں، باوجود یہ کہ میں خدا کی اطاعت کرتا ہوں مگر تم میری نافرمانی کرتے ہو اور معاویہ خدا کی نافرمانی کرتے ہیں اس پر بھی اہل شام ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ خدا کی قسم اگر معاویہ مجھ سے بیع صرف کا معاملہ کریں جس طرح صراف ایک دینار کے بدلے کئی درہم لیتے ہیں اسی طرح معاویہ تم میں سے دس دس کو لیکر اپنے لشکر کا ایک ایک آدمی بھی مجھے دیں تو میں نہایت خوشی سے قبول کرلوں گا' انتہی۔ دیکھئے اہل شام کا جوش کس قدر بڑھا ہوا تھا کہ علی کرم اللہ وجہہ کو ثابت ہوگیا تھا کہ شامیوں کے جوش وولولہ کا دسواں حصہ بھی اپنی فوج میں نہیں ہے۔

اوراس روایت سے بھی اہل شام کا جوش ظاہر ہے جو ناسخ التواریخ کی جلد سوم کے صفحہ ۱۷۲ میں ہے کہ: ''سعید بن قیس عرض کر دیا: امیر المومنین! من حاضرم علی علیہ السلام مصحف رابدو داداو پیش سپاہ معاویہؓ آمدو گفت اے مرومان طغیان مورزید وخدائے رابے فرمانی مکنید امیر المومنین شمارا بدانچہ دریں کتاب است دعوت میکند وشمارا براہ راست میخواہد ازخدا بترسید وبراں راہ روید کہ مہاجرین وانصار رفتند مردم شام سخنان اورا استوار نداشتند واو را با سیف وسنان پارہ پارہ کردن'' انتہی۔

علیؓ کے لشکر میں بیس ہزار قاتلین عثمانؓ:

قرآن کے حکم کو قبول کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے مگر اس موقع میں شامیوں کے غصہ کی حالت یہ تھی کہ ازخود رفتہ تھے۔ خاص وجہ اس کی یہ تھی کہ بلوائی جو عثمانؓ کے قتل میں شریک تھے' ہزار رہا تھے جیسا کہ ناسخ التواریخ کے صفحہ ۲۴۳ میں ہے کہ جب ابو ہریرہؓ اور ابوالدرداءؓ نے معاویہؓ کی طرف سے علی کرم اللہ وجہہ کو پیام پہونچایا کہ اگر آپ عثمانؓ کے قتل میں شریک نہ تھے تو ان کے قاتلین کو ہمارے حوالے کر دیجئے۔ اس وقت بیس ہزار سپاہی جرار سلح پوش کھڑے ہوگئے کہ ہم سب قاتلین عثمان ہیں۔ چنانچہ عبارت اس کی یہ ہے: ''این وقت بست ہزار کس از لشکر علی علیہ السلام کہ محفوف در آہن وفولاد بودند وجز چشم ایشاں دیدار نمی گشت خویشتن رابر ابو ہریرہؓ و بوالدرداءؓ عرض دادند کہ مائیم کشندگان عثمانؓ و بدانچہ امیر المومنین علیؓ درحق حکومت فرماید وحکم براند گردن نہادہ ایم ورضا دادہ ایم'' انتہی۔

غرض کہ فوج کا ایک بڑا حصہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے لشکر میں انہیں بلوائیوں کا

تھا جو عثمانؓ کے قتل میں شریک تھے۔ اہل شام پر سخت ناگوار ہوا کہ انہیں لوگوں نے خلیفۂ مظلوم کو بے عزت اور ذلیل کر کے قتل کیا۔ پھر حکمت عملی سے علی کرم اللہ وجہہ کے لشکر میں شریک ہو کر وہ چاہتے ہیں کہ طرفداران خلیفۂ مظلوم پر بھی غالب آجائیں اور خلیفۂ مظلوم کا خون ہدر کر دیں۔

علماءِ لشکر علیؓ کا اشتباہ کہ حق پر کون ہے؟

یہی اسباب تھے کہ مسلمانوں کو خطائے اجتہادی کا موقع مل گیا' اگر یہ مفسد لوگ حضرت کے لشکر میں شریک نہ ہوتے تو مسلمانوں کو نہ جوش پیدا ہوتا نہ جنگ کی نوبت آتی سب آپ کی خلافت کو تسلیم کر لیتے' ان کی شرکت کا یہاں تک اثر ہوا کہ خود علی کرم اللہ وجہہ کے لشکر میں جو اہل علم تھے ان کو اشتباہ واقع ہوا کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ چنانچہ ناسخ التواریخ کے صفحہ ۲۳۴ میں لکھا ہے "سی ہزار از قاریان قرآن از لشکر گاہ علیؓ و معاویہؓ یکسوئی شدند۔ و جداگانہ خیمہا برافراختند و درع و جوشن بپوشیدند و حدود سیف و سنان بزدوند و انگاہ سخن بریں نہادند کہ چندتن از احبار و اخیار ایشاں بین الصفین آمد و شدن گیرند و موجب این مشاجرت و مبازرت را بین المسلمین مکشوف دارند و آنسوئے کہ برحق دانند پیوستہ گردند انتہی۔

جب خود علی کرم اللہ وجہہ کے لشکر کے علماء کو یہ اشتباہ ہو تو کہئے کہ اہل شام جو اصل واقعہ سے واقف ہی نہ تھے ان کو کس قدر اشتباہ ہونا چاہئے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ بظاہر ان کے شبہ کو قوی کرنے والا ایک امر بدیہی موجود تھا کہ بیس ہزار قاتلین عثمانؓ علی کرم اللہ وجہہ کے لشکر میں شریک تھے۔ اور تعجب نہیں کہ بعض معاونین و انصار بھی انہی کی وجہ سے جنگ

میں مساہلت اور بے اعتنائی کرتے ہوں، جیسا کہ ناسخ التواریخ کے صفحہ ۳۴۱ میں لکھا ہے کہ ایک روز صفین میں گھمسان کی لڑائی ہوئی کہ کشتوں کے پشتے لگ گئے یہاں تک کہ عدی بن حاتمؓ کو امیر المومنین علیہ السلام کی فکر ہوئی اور تلاش میں ہر طرف گھوڑا دوڑایا، جب ملاقات ہوئی تو عرض کی کہ اس وقت متفقہ حملہ کرنا مناسب ہے، لشکر کو حکم دیجئے۔ فرمایا: ذرا نزدیک آؤ جب وہ بہت نزدیک ہوئے تو آہستہ سے فرمایا: ''**ویحک ان عامة من معی یعصینی و ان معاویة فیمن یطیعه و لا یعصیه** ''یعنی میرے ساتھ والوں کی عموماً یہ حالت ہے کہ وہ میری فرماں برداری نہیں کرتے اور معاویہ ایسے لوگوں میں ہیں کہ سب ان کے مطیع و فرمانبردار ہیں اور کوئی ان کی نافرمانی نہیں کرتا۔ انتہی۔

لشکر کا علیؓ کی اطاعت نہ کرنا:

اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اکثر لوگ لشکر کے، مخالف تھے کیونکہ ممکن نہیں کے صدق دل سے بیعت کرنے کے بعد خلیفۂ برحق کی نافرمانی اور عصیان کریں، ابوبکر و عمرؓ کے خطوں پر لشکر اسلام جو جانبازیاں کرتا تھا اس کا عشر عشیر علی کرم اللہ وجہہ کی ہمراہی کے لوگوں نے نہیں کیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ اشتیاہی حالت میں تھے ان نافرمانوں کی صحبت کا ان پر اتنا اثر پڑ گیا تھا کہ وہ بھی نافرمان ہو گئے تھے۔ نہج البلاغہ کے صفحہ ۴۰ میں ہے کہ علی علیہ السلام فرماتے ہیں: ''**اقوم فیکم مستصر خا و انا دیکم متغوثا فلا تسمعون لی قولا و لا تطیعون لی امرا** ''یعنی میں تم میں کھڑا ہوتا ہوں اور چیختا ہوں اور پکار پکار کر کہتا ہوں کہ کوئی میرا فریادرس اور مدد کرنے والا ہے؟ مگر تم لوگ نہ میری بات

سنتے ہو نہ میری اطاعت کرتے ہو انتہی ۔اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ ان کو حضرت کی توہین اور تذلیل مقصود تھی کیونکہ عین جنگ میں لشکر کی یہ حالت ہو کہ افسر اعلی کتنا چیخے اور پکارے کوئی اس کی فریاد رسی نہ کرے تو کیا سمجھا جائیگا کہ وہ لشکر افسر کا خیر خواہ ہے؟ ہرگز نہیں۔ نہج البلاغہ (ج ۱ ص ۱۷۸) میں ایک خطبہ آپ کا نقل کیا ہے جس میں یہ عبارت بھی ہے ''**احمد الله على ماقضى من امر و قدر من فعل و على ابتلانى بكم أيتها الفرقة التى اذا أمرت لم تطع و اذا دعوت لم تجب ان امهلتم خضتم و ان حوربتم خرتم و ان اجتمع الناس على امام طعنتم و ان اجبتم الى مشاقة نكصتم** ''یعنی اے لوگو تمہاری یہ حالت ہے کہ جب میں کوئی حکم کرتا ہوں تو تم اطاعت نہیں کرتے اور جب بلاتا ہوں تو جواب نہیں دیتے اور جب مہلت دیتا ہوں تو باطل امور میں خوض کرنے لگتے ہو اور جب جنگ میں ہوتے ہو تو بزدلی کرتے ہو اور جب لوگ کسی امام پر اتفاق کرتے ہیں تو تم اس کو مطعون کرتے ہو اور جب کسی مشقت کے کام میں شریک ہوتے ہو تو الٹے پاؤں پھر جاتے ہو۔اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ابن سبا کی کمیٹی کے ممبر تھے ورنہ کیا معنی کہ اس قدر مخالفت کی جائے۔

نہج البلاغۃ کے صفحہ (۱۱۷) میں لکھا ہے:''**قد جمع الناس و حضهم على الجهاد فسكتوا مليا فقال عليه السلام امخر سون انتم؟ فقال قوم منهم يا امير المومنين: ان سرت سرنا معک' فقال عليه السلام: مابالكم لا سددتم نرشدو لا هديتم لقصد' افى مثل هذا ينبغى ان اخرج' انما يخرج**

فی مثل ھذا رجل ممن ارضاہ من شجعانکم و ذوی بأسکم و لا ینبغی لی ان ادع المصر و الجند و بیت المال و جبایۃ الارض و القضاء بین المسلمین و النظر فی حقوق المطالبین ''یعنی کسی لڑائی کے موقع میں آپ نے لشکر کے لوگوں کو جمع کیا اور جہاد کی آمادگی کے لئے خطبہ پڑھا' جب بہت دیر گذری تو فرمایا کیا تم لوگ گونگے ہوگئے؟ ان میں سے ایک شخص نے کہا: یا امیر المومنین! اگر آپ چلیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہولیں گے۔ فرمایا: تم لوگوں کی کیسی حالت ہے ذرا سمجھتے نہیں، کیا ایسی چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں بھی میں ہی نکلوں؟ اس کے لئے اکا دکا جوانمرد شخص افسر ہو تو کافی ہے اور مجھے حفاظت بیت المال وغیرہ امور کے لئے شہر میں رہنے کی ضرورت ہے۔

دیکھئے ایک معمولی جنگ پر جانے کے لئے خلیفہ وقت اپنی زبان سے فرما رہے ہیں اور کوئی جواب تک نہیں دیتا اور بعد فضیحت و ملامت کے جواب دیا بھی تو ایسا کہ جب تک آپ اپنی ذات سے دشمن کے مقابل نہ ہوں ہم نہ جائیں گے۔ کیا ایسے لوگ شیعہ ہوسکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

شیعہ درباطن اہل بیت کے دشمن:

وجدان صحیح تو یہی گواہی دیتا ہے کہ وہ لوگ ابن سبا کے تربیت یافتہ تھے' جس کو منظور تھا' اہل بیت کو بدنام اور ذلیل کرے' جس کا حال انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ معلوم ہوگا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی سمجھ گئے تھے کہ یہ کمبخت بظاہر شیعہ ہیں مگر درباطن دشمن ہیں۔ چنانچہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے جو نہج البلاغہ کے صفحہ ۱۱۸ میں لکھی ہے'' واللہ لولا رجائی

الشھادۃ عند لقائی العدو لو قد حم لی لقاؤہ لقربت رکابی ثم شخصت عنکم فلا اطلبکم ما اختلف جنوب و شمال انه لا غناء فی کثرۃ عدد کم مع قلۃ اجتماع قلوبکم ''یعنی خدا کی قسم میں تم صرف اس امید پر ہوں کہ شاید کسی روز دشمن سے مقابلہ ہو جائے اور شہادت نصیب ہو' اگر یہ خیال نہ ہوتا تو سوار ہو کر تم سے دور چلا جاتا اور کبھی تم کو طلب نہ کرتا۔ اب کہئے کیا اس ارشاد کے بعد بھی یہ خیال ہوسکتا ہے کہ حضرت ان کو اپنے شیعہ سمجھتے ہوں گے؟۔ کیا اپنے دوستوں اور جان نثاروں سے بھی کوئی متنفر ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پھر یہ بات آپ نے ایک بار نہیں متعدد مجمعوں میں فرمائی جیسا کہ نہج البلاغہ کی جلد دوم کے صفحہ ۳۶ میں لکھا ہے ''لولا طمعی عند القائی عدوی فی الشھادۃ و توطینی نفسی علی المنیۃ لاجیت ان لا ابقی مع ھولاء یوما واحدا ولا ألتفی بھم ابدا ''یعنی ان لوگوں کے ساتھ رہنے پر مجھے یہ طمع مجبور کر رہی ہے کہ شاید کبھی دشمن سے مقابلہ ہو جائے اور شہادت نصیب ہو' اگر یہ خیال نہ ہوتا تو ان لوگوں کے ساتھ ایک روز رہنا یا کبھی ان سے ملاقات کرنا ہرگز پسند نہ کرتا انتہی۔ غور کیجئے کہ بار بار آپ کے اس قسم کے ارشادات کیا اس بات پر دلیل نہیں ہیں کہ وہ لوگ شیعہ نہ تھے بلکہ مخالف تھے' جن سے آپ تنگ آ گئے تھے اور کس قدر مجبور ہو گئے تھے کہ اپنے خلاف شان یہ بات فرما رہے ہیں' جو نہج البلاغہ کے صفحہ ۲۲۹ میں ہے ''لقد کنت امس امیراً فاصبحت الیوم مامور او کنت امس ناھیا فاصبحت الیوم منھیا ''یعنی کل کے دن میں امیر تھا اور آج یہ نوبت پہونچ گئی ہے کہ مامور ہوں اور کل میں منع کرتا تھا اور

آج تمہارے باعث لوگ مجھی کو منع کرنے لگے۔ انتہی۔ یہ تو کہہ ہی نہیں سکتے کہ فی الحقیقت آپ ان لوگوں کے ماموراور رعیت بن گئے تھے' بلکہ ان لوگوں نے خلافت کی کسر شان کر دی تھی جس سے مقصود یہ تھا کہ مخالفین پر ظاہر ہو جائے کہ آپ میں معاذ اللہ خلافت کی لیاقت ہی نہیں۔ کیا ایسے لوگ شیعہ کہلانے کے مستحق ہیں؟ ہرگز نہیں۔

شیعہ پر حضرت کا علی بد دعا فرمانا:

اسی وجہ سے باوجود یہ کہ آپ نہایت حلیم اور رحمدل تھے مگر ان پر بد دعا کی جیسا کہ نہج البلاغہ صفحہ ۳۰ میں لکھا ہے: ''**اللھم انی قد مللتھم و سئمتھم و سئمونی فأ بدلنی بھم خیراً منھم و ابدلھم بی شراً منی اللھم مث قلو بھم کما یماث الملح فی الماء**'' یعنی یا اللہ! میں نے ان کو تھکا دیا اور انہوں نے بھی مجھے تھکا دیا کب ان کے بدلہ میں مجھے ان سے بہتر لوگ دے اور ان پر میرے بدلے میں برے حاکم کو مسلط کر' یا اللہ! ان کے دلوں کو اس طرح گلا ئیو جیسے پانی میں نمک گلتا ہے انتہی۔ اب کہئے کیا یہ بد دعا آپ نے اپنے جان باز شیعہ کو دی ہوگی؟ ہرگز نہیں۔ ان کے دلوں کو تباہ کرنے کے لئے جو بد دعا کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ان کی دلی خواہشوں پر مطلع تھے کہ وہ آپ کو بدنام کرنے کی خواہش سے آپ کے لشکر میں شریک ہو گئے تھے۔ ادنی تامل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ منافق تھے جن کا سرغنہ ابن سبا تھا' کیونکہ ہمیں طرفین کی روایتوں سے معلوم ہو گیا کہ اس انقلاب عظیم کا محرک اور اس فتنہ کا بانی وہی تھا پھر جب یہ فتنہ اس قدر موج زن ہوا کہ صرف جنگ جمل اور صفین میں ایک لاکھ انتیس ہزار پانچسو مسلمان غرقاب

بحر فنا ہوئے‘ جیاس کہ ناسخ التواریخ سے ظاہر ہے تو ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ایک بڑی جماعت منافقوں کی بنالی تھی جس کی لگاتار کوششوں سے مسلمانوں میں ہمیشہ کیلئے تفرقہ پڑ گیا اور لاکھوں مسلمان قتل ہوئے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کل منافق حضرت امیر المومنین ہی کی طرف تھے اس لئے کہ خلیفۂ برحق اس وقت آپ ہی تھے‘ جس طرح آنحضرت ﷺ کے وقت صحابہ میں منافق شامل تھے اس وقت وہ دار الامارت میں خلیفۃ المسلمین کے ساتھ تھے جو عین معرکوں کے وقت ہٹے ہوگئے تا کہ امیر المومنین خصم کے مقابلہ میں ذلیل ہوں‘ جس طرح غزوہ احد کے روز منافق لشکر اسلام میں شریک ہوکر عین معرکہ کے وقت بھاگ گئے تھے‘ جس سے بعض مسلمانوں کے بھی پاؤں اکھڑ گئے۔ تاریخ کامل میں لکھا ہے کہ غزوہ احد کے روز لشکر اسلام میں ایک ہزار آدمی تھے ان میں ثلث منافق تھے جو بھاگ گئے اور ان کا نفاق ثابت ہوگیا۔ اسی طرح حضرت امیر المومنین کے لشکر میں ثلث یا اس سے بھی زائد منافق ہوں تو کیا تعجب‘ بلکہ روایات نہج البلاغۃ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً کل منافق تھے‘ اس لئے کہ کل لشکر سے حضرت نے اپنا ملال اور بیزاری ظاہر کر کے ان کے حق میں بددعائیں کیں‘ چونکہ یہ لوگ باوجود شیعہ کہلانے کے دل میں عداوت رکھتے تھے اس لئے ان کے دل کی تباہی کے لئے بددعا کی‘ جس طرح آپ کو خدا کہنے والی جماعت کو آپ نے جلا دیا تھا۔ غرضکہ ابن سبا کا تربیت یافتہ اور ہم خیال ایک لشکر کثیر حضرت امیر المومنین کے لشکر میں ضرور شامل تھا جس نے تمام لشکر کو تباہ کیا اور باوجود اس کے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ شجاعت میں نظیر نہیں رکھتے تھے اور شیعہ جانباز بھی بہت

موجود تھے مگر ان کی رفاقت کی نکبت سے فتح نہ ہو سکی۔ تدبیر اور ہوشیاری اسے کہتے ہیں کہ ابن سبا نے سب کچھ کیا مگر کسی کو احساس تک نہیں۔

ابن سبا کے مناسب حال ایک حکایت:

اس کے مناسب حال ایک حکایت سنی گئی کہ شیطان سے کسی کو محبت ہوگئی تھی ایک روز فتنہ انگیزیوں کا ذکر آ گیا' کہا چلو ہم تمہیں ایک تماشہ دکھلائیں ایک بقال کی دوکان پر اسے لے گیا وار تھوڑا سا گڑ لے کے دیوار پر لگا دیا اور دونوں دور جا کر بیٹھے' گڑ پر مکھیاں جمع ہوئیں مکڑی نے ان پر جست کی' چڑیا نے مکڑی پر حملہ کیا' کہیں بلی بھی چڑیا کے تاک میں بیٹھی ہوئی تھی فوراً اس کا شکار کر لیا کسی کا شکاری کتا بھی وہاں تھا اس نے بلی کو پھاڑ کھایا' بلی کسی کی پلی ہوئی تھی اتفاقا وہ بھی وہاں موجود تھا اس نے کتنے کو مار ڈالا کتے کے مالک کو خبر پہونچی وہ دوڑا اور اس شخص کو قتل کر ڈالا مقتول کے قرابتداروں کو خبر ہوئی وہ فوراً مسلح ہو کر آن پہونچے ادھر قاتل کے طرفدار بھی جمع ہوگئے' اور طرفین میں خوب کشت وخون اور خانہ براندازیاں ہوئیں' یہ تماشہ دیکھ کر دونوں چلے گئے اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ گڑ کا ٹپکا لگانے والا کون تھا؟ ابن سبا منافق بھی شیطان سے کم نہ تھا' مصر میں بیٹھے بیٹھے چند مسئلے چھیڑ دیئے اور مسلمانوں کی خونریزیوں کا تماشہ دیکھا۔ کہا ہر چند ایسے مفسدوں کا روپوش ہونا ایک لازمی امر ہے' مگر وجدان صحیح بھی عجیب نعمت عظمی ہے کہ آثار وقرائن سے ان کو گرفتار کر ہی لیتا ہے۔ دیکھئے طبیب حاذق آثار وقرائن سے بیماری کو مشخص کر کے یہ حکم لگا دیتا ہے کہ مختلف اعضاء اور مقامات میں جو فساد واختلال پیدا ہوا ہے فلاں مفسد کا اثر ہے' جو بیماری وطبیب سے روپش ہے۔

مسئلہ رجعت

ابن سبا نے، چونکہ یہودی تھا، چند مسئلے اپنے دین کے مسلمانوں میں اس غرض سے شائع کئے کہ مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو جائے۔ منجملہ ان کے ایک مسئلہ رجعت ہے۔ خاص یہود کا عقیدہ ہے کہ مرے ہوئے بزرگ لوگ دنیا میں رجوع کر سکتے ہیں چنانچہ ''ملل ونحل'' میں شہرستانیؒ نے یہود کے عقائد میں لکھا ہے کہ ''ان کا عقیدہ ہے کہ ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ اسلام نے حسد سے قتل کیا، اس لئے کہ یہود موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ ہارون علیہ السلام کی طرف مائل تھے، اگر چہ کہ وہ قتل ہوئے مگر پھر دنیا میں رجعت کریں گے۔ اور بعض کا عقیدہ ہے کہ وہ مرے نہیں غائب ہو گئے ہیں، وقت مقررہ پر پھر آئیں گے'' انتہی۔

ابھی معلوم ہوا کہ ابن سبا نے اسی مسئلہ سے ابتداء کی، اس طرح کہ عیسیٰ علیہ السلام کا جب دوبارہ آنا ثابت ہے تو محمد ﷺ جو ان سے افضل ہیں ان کی رجعت کرنے میں کیا تامل جب یہ مسئلہ اپنے اتباع میں اس نے شائع کیا اور ایک جماعت کثیر واس کی قائل ہوگئی جو علی کرم اللہ وجہہ کے لشکر میں تھی تو بعد والے لوگ بھی خوش اعتقادی سے قاء ہو گئے کہ رجعت ممکن ہے، کیونکہ گو وہ منافق تھے مگر شیعہ کہلاتے تھے۔ اور جس طرح قائلین الوہیت علی کرم اللہ وجہہ مرتے دم تک آپ کی محبت کا دم بھرتے تھے ان کی بھی یہی حالت تھی۔ غرض کہ بعد والوں کو اس قسم کے مسائل میں التباس ہوا اور یہ خیال کر لیا کہ اصل شیعہ رجعت وغیرہ کے قائل ہیں۔ ناسخ التواریخ جلد سوم صفحہ ۱۶۷ میں لکھا ہے ''اما ابن عباس و

جماعتے از اصحاب عرض کردند کہ یا امری المومنین عبداللہ بن سبا خاصہ از کردہ پشیماں گشت و اورا شفاعت کردند فرمود اورا معفو میدارم بشرطیکہ در کوفہ سکون اختیار نکند گفتند بکجا شود فرمود درمدائن پس عبداللہ بن سبا از کوفہ ہجرت کرد و درمدائن اقامت کرد تا امیر المومنین علیہ السلام شہدی گشت ایں وقت دیگر بارہ عقیدت خویش آشکار کرد و آں سخنہا اعات نمود جماعتے دعوت اورا اجابت کردند و درگرد او انجمن شدند و عبداللہ بن سبا بانگ درداد و گفت سوگند باخدائے اگر مغز و دماغ اورا در ہفتاد مرہ در نزد ما حاضر کنند میدانیم کہ او نمردہ است و ہرگز نمیرد تا عرب را بیک چوب نراند بالجملہ عبداللہ بن صبرہ و عبداللہ بن عمر و کندی و گروہے بزرگ درگرد عبداللہ بن سبا فراہم شدند و سخن ایشاں در بلاد و امصار پراگندہ گشت‘‘۔

دیکھئے اس عبارت سے ثابت ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ کی بھی رجعت کا وہ قائل تھا۔ چنانچہ اسی بناء پر بہت سے فرقے رجعت کے قائل ہوگئے۔ان واقعات سے یہ بھی ثابت ہے کہ ابن سبا کے خیالات کا اثر پہلے ملک ایران پر پڑا کیونکہ علی کرم اللہ وجہہ نے اسے اخراج کر کے مدائن کو روانہ فرما دیا تھا اور مدائن قدیم سے ملک ایران کا پایۂ تخت اکثر رہا ہے۔ پھر علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں تو وہ ساکت تھا مگر آپ کی شہادت کے ساتھ ہی اس نے ایک بری جماعت بنالی اور اپنے خیالات کی اشاعت شروع کردی۔

فرق مراتب نہ کرنا بے دینی کا پیش خیمہ

اب غور کیجئے کہ جب وہ ہزارہا منافق ابن سبا کے تربیت یافتہ جو حضرت کے جانی دشمن تھے، جن کے حق میں آپ نے بددعائیں کیں، اپنے آپ کو شیعہ ظاہر کر کے لوگوں میں

ابن سبا کے اختراعی مسائل شائع کرتے ہوں گے' اور یہ مستقل بری جماعت جو ابن سبا نے اشاعت مذہب کے لئے تیار کر لی تھی مستقل طور پر کارگذار ہوگی' اور سب کا اصول ایک ہی تھا کہ ہر غرض و غایت میں نبی کریم ﷺ کے اہل بیت کرام کی محبت و عظمت پیش کر رہے ہیں تو کہئے کہ عوام الناس کس طرح خوش اعتقادوں کے نمبر اول میں شریک ہونے کو سعادت سمجھتے ہوں گے۔ چنانچہ اب بھی مشاہد ہے کہ قرآن و حدیث میں جو کھلے کھلے اعتقادات ہیں اگر بیان کئے جائیں تو سوائے معدودے چند کے وہاں کوئی نہیں جاتا بخلاف اس کے توحید وجودی اور آنحضرت ﷺ کی الوہیت جہاں بیان ہوتی ہے وہاں عوام الناس کا اتنا مجمع ہوتا ہے کہ بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ حالانکہ جن حضرات نے یہ مسلک اختیار کیا ہے وہ صاف لکھتے ہیں کہ نہایت خطرناک طریقہ ہے اگر فرق مراتب اچھی طرح نہ کیا جائے تو آدمی زندیق ہو جاتا ہے' چنانچہ مولانا جامی قدس سرہ فرماتے ہیں:

اے بردہ گماں کہ صاحب تحقیقی   واندر صفت صدق و صفا صدیقی
ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد   گر حفظ مراتب نکنی زندیقی

فرق قائلین رجعت:

دیکھئے ابن سبا نے مسئلۂ رجعت جو اختراع کیا اس میں کتنے فرقے ہوگئے۔ ''ملل ونحل'' سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ میں جو فرقہ مختاریہ ہے اس کا اعتقاد ہے کہ محمدؒ بن حنفیہ ایک پہاڑ میں چھپے ہوئے ہیں جس کا نام رضوی ہے' اسی میں دو چشمے بہتے ہیں ایک شہد کا دوسرا پانی کا' وہ پھر نکلیں گے اور عدل سے دنیا کو بھر دیں گے۔

ہاشمیہ میں ایک فرقہ قائل ہے کہ عبداللہ بن معاویہ جو امام برحق تھے وہ غائب ہو گئے ہیں پھر ظاہر ہوں گے۔

بنانیہ کہتے ہیں کہ علی کرم اللہ وجہہ کبھی کبھی ظاہر ہوا کرتے ہیں اور ابر جو گرجتا ہے یہ انہیں کی آواز ہے اور بجلی جو چمکتی ہے یہ ان کا تبسم ہے۔

جارودیہ کہتے ہیں کہ محمد بن عبداللہ بن الحسن بن الحسین علیہ السلام جو امام برحق تھے وہ قتل نہیں کئے گئے، زندہ ہیں قریب میں نکلیں گے اور دنیا کو عدل سے بھر دیں گے۔

باقریہ کہتے ہیں کہ امام باقرؒ پھر رجعت کریں گے۔ ناوسیہ کا عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادقؒ زندہ ہیں اور جب تک ظاہر ہو کر امامت کو انجام نہ دیں گے' نہ مریں گے۔

واقفیہ کہتے ہیں کہ موسیٰ کاظمؒ غائب ہو گئے ہیں' قریب ہے کہ نکلیں گے اور امامت کو زندہ کریں گے۔

اسماعیلیہ میں ایک فرقہ قائل ہے کہ محمد بن اسمٰعیل بن جعفر صادقؒ جو امام تھے غائب ہو گئے ہیں' پھر تشریف لائیں گے۔

اثنا عشریہ جو حسن عسکریؒ کی امامت کے قائل ہیں ان میں ایک فرقہ کا اعتقاد ہے کہ وہ مرے نہیں غائب ہو گئے ہیں پھر ظاہر ہوں گے۔

مغیریہ کہتے ہیں کہ محمدؒ بن عبداللہؓ جو امام تھے وہ مرے نہیں غائب ہو گئے ہیں۔ اور ان میں سے ایک فرقہ کا اعتقاد ہے کہ مغیرہ اگرچہ قتل کئے گئے مگر پھر رجعت کریں گے۔ دیکھئے یہ صرف ابن سبا کی تعلیم کا اثر ہے کہ اعتقاد رجعت کو اس نے مسلمانوں میں ایسا مستحکم

کیا کہ فرقے اپنے معتقد علیہ بزرگوں کی رجعت کے قائل ہوگئے۔اس سے مقصود یہی تھا کہ دوسرا فرقہ اگر کسی دوسرے کی امامت کا قائل ہوجائے تو اس کی مخالفت کی جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ اس نئے امام کی ضرورت نہیں، وہی غائب یا مرے ہوئے امام کافی ہیں جو آئندہ چل کر رجوع کریں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک فرقہ ایک امام کو مان کر دوسرے بزرگ کی امامت کا انکار کیا جس سے باہمی مخالفتیں پیدا ہوگئیں۔ ابن سبا سے پہلے کوئی یہ مسئلہ جانتا بھی نہ تھا۔ ورنہ اہل اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رجعت کے قائل ہوتے کیونکہ جب ائمہ رجعت کرسکتے ہیں تو آنحضرت ﷺ تو بطریق اولی رجعت فرماسکتے ہیں۔ الحاصل اس میں شبہ نہیں کہ ابن سبا نے اس مسئلہ کو اسلام میں شائع کیا جیسا کہ ناسخ التواریخ سے ابھی معلوم ہوا اور ناواقف مسلمانوں نے اس کو مان لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باہمی مخالفتیں پیدا ہوگئیں اور یہی اس کا اصلی مقصود بھی تھا۔

وصی اور امامت کا مسئلہ

وصی اور امامت کا مسئلہ بھی یہود کے معتقدات میں ہے۔ چنانچہ ''ملل ونحل'' میں یہود کے عقائد میں لکھا ہے کہ ''ان کا اعتقاد ہے کہ نبوت موسی اور ان کے بھائی ہارون علیہما السلام میں مشترک تھی اور ہارون علیہ السلام موسی علیہ السلام کے وصی بھی تھے مگر جب موسی علیہ السلام کی زندگی میں ان کا انتقال ہوگیا تو موسیٰ علیہ السلام نے یوشع بن نون کو وصیت کی کہ توارات اور الواح کے اسرار شبر اور شبیر کو پہونچادیں جو ہارون علیہ السلام کے فرزند ہیں

کیونکہ مستقل امامت ان ہی کیلئے مقرر تھی۔اور یوشع گو وصی تھے مگر منصب وصیت ودیعۃ ان کو دیا گیا تھا‘ اصل وصی اور امام وہ دونوں صاحبزادے تھے۔انتھی ملخصا۔

دیکھئے کس قدر اہتمام ہے کہ یوشع بن نون علیہ السلام باوجودیہ کہ وہی کام کرتے تھے جو انبیاء کا کام ہے‘ بلکہ خود نبی بھی تھے اور اسرار توریت اور الواح پر مطلع بھی تھے‘ مگر یہود نے ان کو وصی نہیں قرار دیا کیونکہ وصی ان کے زعم میں وہی شخص ہوسکتا ہے جو قرابت دار ہو اور امامت کے لئے وصی کا ہونا شرط ٹھیرا‘ اسی وجہ سے ان کا عقیدہ ہے کہ اصل وصی اور امام دونوں صاحبزادے ہیں‘ یہ یہود کا عقیدہ تھا اس کا ذکر نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں مگر ابن سبا نے اس مسئلہ کو ایسا ذہن نشین کیا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی قائل ہوکر ممتاز ہوگئی۔

چنانچہ ناسخ التواریخ صفحہ ۷۲ میں ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے موسی علیہ السلام سے فرمایا کہ میں نے تمہارے بھائی ہارون کو تمہاری وزارت کے لئے اختیار کیا جس طرح محمد ﷺ کیلئے ایلیا کو اختیار کیا جو ان کے بھائی اور ان کے وزیر اور ان کے وصی اور ان کے بعد ان کے خلیفہ ہوں گے‘ تم دونوں بھائیوں کو خوشخبری ہے اور ان دونوں بھائیوں کو خوشخبری ہے‘ ایلیا کے دو فرزند ہیں حسن اور حسین اور تیسرے محسن جیسا کہ ہارون کے بھی تین لڑکے ہیں شبر‘ شبیر اور مشبر انتھی۔

اختلاف ور امامت نزد شیعہ:

غرضکہ اس قسم کی روایتیں مسلمانوں میں اس نے شائع کردیں اور ناواقفوں نے خوش اعتقادی سے مان لیا اور اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں باہمی مخالفتیں قائم ہوگئیں۔

پہلی مخالفت یہ ہوئی کہ ایک فرقہ شیعہ علی کرم اللہ وجہہ کے لقب سے ملقب ہوکر علیحدہ ہوگیا پھران میں بھی بہت سے فرقے ہوگئے جوایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ چنانچہ کیسانیہ محمد بن حنفیہ ؒ کے معتقداوران کی امامت کے قائل ہیں اور ہاشمیہ ابوہاشم کوامام سمجھتے ہیں جومحمد بن حنفیہ ؒ کے فرزند تھے‘ ان کا اعتقاد ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے تمام اسرار محمد بن حنفیہ ؒ کو بتلائے تھے‘ انہوں نے اپنے فرزند ابوہاشم کے انتقال کے بعد پانچ فرقے ہوگئے‘ ایک فرقے کا اعتقاد ہے کہ انہوں نے محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کو وصیت کی اور وہی وصیت ان کی اولاد میں جاری رہی یہاں تک کہ خلافت ابوالعباس کو پہونچی‘ کیونکہ ان کو آنحضرت ﷺ کی قرابت کی وجہ سے خلافت کا حق تھا۔ اورایک فرقہ نے ابوہاشم کے بھتیجے جن کا نام حسن بن علی بن محمد بن حنفیہ تھا ان کوامام اوران کا خلیفہ قرار دیا۔ اورایک فرقہ نے کہا کہ وہ مستحق نہیں ہوسکتے‘ ابوہاشم نے اپنے بھائی علی بن محمد کواپنا وصی بنایااورعلی نے اپنے فرزند حسن کو‘ غرض کہ امامت محمد بن حنفیہ کی اولاد سے باہر نہیں جاسکتی۔ اورایک فرقہ نے کہا یہ غلط ہے‘ ابوہاشم نے عبداللہ بن عمروبن حرب کندی کووصی بنایااور خلافت بنی ہاشم سے نکل گئی۔ کیونکہ ابوہاشم کی روح عبداللہ کی طرف منتقل ہوئی‘ اس کے بعد کسی سبب سے انہوں نے عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کوامام قرار دیا جب عبداللہ کا انتقال ہواتو دوفرقے ہوگئے بعضوں نے کہا کہ وہ مرے نہیں پھر رجوع کریں گے‘ اس لئے کسی کو امام مقرر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور بعضوں نے کہا بے شک وہ مرگئے اوران کی روح اسحاق بن زید بن الحارث الانصاری کے جسم میں منتقل ہوئی۔ اس فرقہ کا نام حارثیہ

ہے۔عبداللہ بن معاویہ اور محمد بن علی کے اصحاب میں سخت مخالفت ہے اور ایک فرقہ کا اعتقاد ہے کہ امامت ابو ہاشم سے بنان بن سمعان نہدی کی طرف منتقل ہوئی۔ از امیہ کہتے ہیں کہ خلافت یوں منتقل ہوتی گئی کہ علیؓ سے ان کے فرزند محمد کو ملی' ان سے ابو ہاشم کو' ان سے علی بن عبداللہ بن عباس کو' ان سے محمد بن علی کو بالوصیۃ ان سے ان کے بیٹے ابراہیم کو ملی اور وہی امام ہیں۔ زیدیہ کہتے ہیں کہ امامت حضرت فاطمہ علیہا السلام کی اولاد کے سواء کسی کو نہیں مل سکتی اور وقت واحد میں دو امام بھی ہو سکتے ہیں جیسے محمد اور ابراہیم جو فرزند عبداللہ بن حسن بن حسین علیہ السلام کے تھے۔ جارودیہ کہتے ہیں کہ امامت علیؓ سے حسنؓ کو ان سے حسینؓ کو ان سے علی بن حسین زین العابدینؓ کو ان سے زید بن علی کو ان سے محمد بن عبداللہ بن حسن بن حسین کو پہونچی۔ سلیمانیہ جو سلیمان بن جریر کے اتباع ہیں وہ کہتے ہیں کہ ابو بکرؓ و عمرؓ کی خلافت بھی امامت حقہ تھی اگر چہ اس میں خطائے اجتہادی ہوئی۔ سلیمان کا قول ہے کہ رافضیوں کے اماموں نے دو باتیں اپنے شیعہ کے لئے خوب گھڑ لی ہیں۔ ایک قول بالبداء کہ جب وہ پیشنگوئی کرتے ہیں کہ ہمارا غلبہ ہوگا اور چنیں ہوگا اور چناں ہوگا اور وہ جھوٹی ثابت ہو تو کہہ دیا کرتے ہیں خدا کو یہ بات بعد میں سوجھ گئی پہلے وہی بات تھی جو ہم نے کہی تھی۔ دوسرا تقیہ کہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں پھر جب کوئی بات جھوٹ ثابت ہوتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے تقیہ کیا تھا۔ امامیہ بعد امام حسنؓ اور امام حسینؓ اور علی بن حسین علیہ السلام کے ایک رائے پر متفق نہیں۔ ستر (۷۰) سے زیادہ ان کے فرقے ہو گئے ہیں۔ ناوسیہ کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام امام برحق ہیں اور ہنوز زندہ ہیں پھر ظاہر ہو کر امامت کریں

گے اور وہی قائم اور مہدی ہیں۔ افطحیہ کہتے ہیں کہ وہ مر گئے اور امامت ان کے بیٹے عبداللہ الافطح کو پہنچی اور اسماعیل کے بھائی ہیں۔ شنطیہ کہتے ہیں کہ امامت ان کے فرزند کی طرف منتقل ہوئی جن کا نام محمد ہے۔ اور موسویہ کہتے ہیں کہ امامت ان کی ان فرزند کی طرف منتقل ہوئی جن کا نام موسیٰ ہے۔ اسمعلیہ کہتے ہیں کہ امامت ان کے فرزند اسمعیل کی طرف منتقل ہوئی یہ خلاصہ کتب ملل کا ہے۔ غرضکہ اس قسم کے اختلاف اور بہت سے فرقوں میں ہیں یہاں صرف اسی قدر بتلانا منظور ہے کہ حضرات شیعہ کو صرف سنیوں ہی سے مخالفت نہیں بلکہ باہمی مخالفتیں بھی بہت سی ہیں۔ ادنی تامل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ عبداللہ بن سبا نے جو مسئلۂ وصیت و امامت پر زور دیا اس کا مقصود صرف یہی تھا کہ اس مسئلہ کی وجہ سے مسلمانوں میں ایسا اختلاف پڑ جائے کہ موافق' مخالف سب میں مخالفت جاری رہے اس لئے کہ یہ وہ امامت تو ہے ہی نہیں جو احادیث میں وارد ہے جس کو خلافت یا امامت یا سلطنت کہتے ہیں جس کا پہچاننا آسان ہے جیسے ابوبکرؓ وعمرؓ کی خلافت و امامت تھی کہ تمام اسلامی دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا جو ان سے واقف نہ ہو ایسے امام کی مخالفت کا حکم احادیث میں مصرح ہے کہ جو مخالف ہو اور امام بننا چاہے قتل کر ڈالا جائے جیسا کہ مشکوۃ شریف میں ہے: ''**عن ابی سعید قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا بویع الخلیفتان فاقتلوا الاخر منھما** '' راوہ مسلم یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب وہ خلیفوں کے ہاتھ پر بیعت ہونے لگے تو دوسرے کو قتل کر ڈالو۔ اور نہج البلاغہ صفحہ (۱۱۱) جلد دوم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول نقل کیا ہے کہ ''**ما اختلفت دعوتان الا کانت**

احد اھما ضلالۃ ’’یعنی جب دو دعوے مختلف ہوں تو ایک ضرور ضلالت وگمراہی ہوگی یعنی باوجود ایک خلیفہ ہونے کے دوسرا خلافت کا دعویٰ کرے تو بحسب حدیث شریف وہ گمراہ سمجھا جائے گا۔ اسی وجہ سے خلفائے ثلاثہ کے زمانے میں آپ نے کبھی دعوائے خلافت کی کسی سے بیعت نہ لی اور عثمانؓ کی شہادت کے بعد بھی یہ شرط لگادی کہ اگر ایک شخص بھی خلاف کرے تو پھر کسی سے بیعت نہ لی جائے گی۔ اور خلافت سے دست بردار ہو جائیں گے۔

ضرورتِ امیر وحاکم:

اسی وجہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور اپنے استحقاق کا دعویٰ تھا بھی تو اس سے دست بردار ہوگئے۔ کیونکہ امارت اور خلافت سے جو مقصود ہے وہ ایک سے حاصل ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ نہج البلاغہ (ج ۱ ص ۴۱) میں ہے ’’من کلامہ علیہ السلام: وانہ لا بد للناس من امیر بر او فاجر یعمل فی إمرتہ المؤمن ویستمتع فیھا الکافر و یبلغ اللہ فیھا الاجل و یجمع بہ الفیئی ویقاتل بہ العدو وتأمن بہ السبل و یؤخذ بہ للضعیف من القوی حتی یستریح برویستراح من فاجر ’’یعنی ہر وقت ایک امیر کی ضرورت ہے۔ (خواہ وہ نکوکار ہو یا فاجر) جس کی امارت میں دشمنوں کے ساتھ جنگ ہو اور راستوں میں امن قائم ہو اور ضعیف قوی سے اپنا حق لے سکے‘ اچھے لوگ راحت پائیں‘ اور فاجروں سے راحت ملے انتہی۔ دیکھئے اصل امارت وامامت یہی ہے جو خود حضرت امیر المومنینؓ فرمارہے ہیں

کہ اس سے انتظام سلطنت مقصود ہے' نہ اس کے لئے اہلبیت میں سے کوئی ہونا شرط ہے نہ متقی عالم ہونے کی ضرورت ہے۔ اس ارشاد سے ثابت ہے کہ فاجر بھی اس کام کو انجام دے سکتا ہے اور وہ امیر یعنی امام سمجھا جائے گا۔ چونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ارشاد سے ثابت ہے کہ امامت سے مقصود صرف انتظام سلطنت ہے۔ اور ہر بر و فاجر امام ہوسکتا ہے اسی وجہ سے بنی امیہ وغیرہ کی امامت اور سلطنت مسلم ہوگئی اور مسلمانوں نے ان کو معزول کرنے کی فکر نہیں کیو کیونکہ ابقائے تمدن کے لئے ایک حاکم کی ضرورت تھی جس کے ظل حمایت میں آدمی اپنے دشمنوں کی تعدی سے بچ سکے' سو وہ پوری ہوگئی۔ اس کے لئے ذاتی فضائل کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ دیکھئے اگر کسی قوم میں کوئی فقہ کی کسی ایک کتاب کا عالم ہو اور انہیں میں دوسرا شخص متصف بصفات کمالیہ موجود ہو مثلاً صدرا' شمس بازغہ وغیرہ از بر پڑھا تا ہو اور سید شریف القوم بھی ہو اور کہیں کا زمیندار و جاگیردار بھی ہو' علاوہ اس کے عابد' زاہد' تہجد گذار صائم الدہر بھی ہو تو جب نماز کا وقت آئے گا تو امامت کا مستحق وہی شخص ہوگا جو فقہ کی کتاب کا عالم ہے اور وہ فاضل' عابد' سید صاحب ہرگز امامت کے مستحق نہ ہوں گے کیونکہ ہر چیز کے استحقاق کے لئے خاص قسم کے فضائل معتبر ہیں۔ چونکہ خلفائے ثلاثہ کے زمانہ میں مقصود خلافت اچھی طرح حاصل ہوا اسلام کی اشاعت خاطر خواہ ہوئی' قومی ترقی جس طرح چاہیئے ہوتی گئی۔ اسلامی دنیا میں امن وامان قائم ہوا' اتحاد و ہمدردی کے اصول مستحکم ہوئے' اس وجہ سے علی کرم اللہ وجہہ کو کسی قسم کے تعرض کی ضرورت نہ ہوئی کیونکہ خلافت سے جو مقصود آپ نے بیان فرمایا ہے وہ حاصل ہوگیا اور

آپ بھی اس بارگراں سے سبکدوش رہے۔ رہا یہ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی اس زمانہ میں خلافت کرتے تو ممکن تھا کہ یہ اغراض حاصل ہوتے سو یہ درست ہے‘ مگر چونکہ صحابہ نبی کریم ﷺ کے مزاجدان اور رمز شناس تھے انہوں نے دیکھا کہ آپ اس عالم سے رخصت ہوتے وقت اپنا سجادہ نشین اور جانشین صدیق اکبرؓ کو بنایا یعنی امامت کے مصلے پر آپ کو جگہ دی اور ان کو اپنا قائم مقام کیا تو یہ بات ان کو سمجھ میں آ گئی کہ دین اسلام صرف تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے اور اس میں خاص کر نماز سب سے زیادہ باعث تقرب ہے کیونکہ وہ معراج المومنین ہونے کی وجہ سے اس میں مناجات اور راز داری حق تعالیٰ سے نصیب ہوتی ہے۔ ایسے امر میں ان کو حضرت نے اپنا قائم مقام بنایا تو دوسرے امور میں تو بطریق اولی وہ جانشین ہوں گے۔ یہی بات حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ جب حصرت نے ان کو ہمارے دین کے لئے منتخب فرمایا تو ہم نے اپنے دنیوی امور کے لے بھی انہیں کو اختیار کیا‘ یعنی خلیفہ و جانشین مقرر کیا۔ مشائخین کرام نے لفظ سجادہ نشینی کو یہیں سے استنباط کیا ہے۔ چنانچہ جس مقام میں سلاطین لفظ تخت نشینی کا استعمال کرتے ہیں‘ یہ حضرات سجادہ نشینی کہتے ہیں‘ اس لحاظ سے کہ پہلے سجادہ نشین صدیق اکبرؓ ہیں ورنہ صرف جائے نماز پر بیٹھ جانا وجہ تسمیہ نہیں ہوسکتا۔ غرضکہ خلافت سے جو مقصود ہے وہ وہی ہے جو علی کرم اللہ وجہہ نے بیان فرمایا اور جس پر صحابہ کا عمل درآمد رہا کیا ہے۔

ابن سبا نے خلافت کی جو شرطیں لگائیں وہ نہ علی کرم اللہ وجہہ کے ارشاد کے مطابق ہیں نہ کسی حدیث سے ثابت اور نہ اس پر صحابہ کا عملدرآمد رہا پھر طرفہ یہ کہ اس نے جس

امامت پر زور دیا اس کیلئے نہ کروفر کی ضرورت ہے نہ کسی کے واقف ہونے کی‘ گوشہ نشین اور صحرا نورد بھی امام سمجھے جائیں گے جن کو کوئی پہچانتا نہ ہو اور ان کی مخالفت کرنے اور ان کا سا دوسرا معتقد علیہ قائم کرنے سے کوئی واجب القتل نہیں ہو سکتا جس کا حکم آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے بلکہ ہر محلّہ‘ قریہ اور شہر کے لوگ اپنے معتقد علیہ سید صاحب کو امام قرار دے سکتے ہیں وہ کیا جانیں کہ دوسرے مقام میں بھی کوئی بزرگ سید صاحب ہیں جو امامت کے مستحق ہوں۔

امامت ظاہری (سلطنت) اور امامت باطنی (قطبیت)

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اوائل میں لفظ امام بادشاہ وقت کے معنی میں مستعمل تھا جیسا کہ احادیث سے ظاہر ہے اور باوجودیکہ اہل بیت کرام کو یہ خدمت نہ تھی مگر وہ بھی امام سمجھے جاتے ہیں ‘اس کی کیا وجہ؟ صواعق محرقہ میں ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک روز خلیفہ رشید نے دیکھا کہ امام موسیٰ کاظمؒ کعبہ شریف کے پاس بیٹھے ہیں کہا کیا آپ ہی ہو کہ پوشیدہ لوگوں سے بیعت لیا کرتے ہیں؟ فرمایا:’’ہاں‘‘۔ ’’انا امام القلوب و انت امام الجسوم ‘‘یعنی فرمایا کہ میں دلوں کا امام ہوں اور تم اجسام کے مطلب یہ کہ ہمارے بیعت دوسری قسم کی ہے کہ دلوں کو معرفت الٰہی سے منور کرتی ہے اس کو سلطنت سے کوئی تعلق نہیں۔ فی الواقع یہی امامت مقصود بالذات ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ کی بعثت اسی غرض سے تھی کہ سرگشتگان وادی ضلالت کو ہدایت کر کے خدائے تعالیٰ تک پہونچادیں‘ بعثت سے مقصود بالذات سلطنت نہیں کیونکہ سلاطین فقط تمدن قائم کرنے کیلئے ہوتے ہیں

خواہ شرعی اصول پر ہو یا قانونی۔

کلینی صفحہ ۱۵۱ میں روایت ہے ”قال ابو جعفر علیه السلام یا ابا خالد لنور الامام فی قلوب المومنین انور من الشمس المضیئة بالنهار وهم والله ینورون قلوب المومنین ”یعنی فرمایا امام جعفر علیہ السلام نے کہ امام کا نور جو مسلمانوں کے دلوں میں ہوتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ روشن ہے جو آفتاب کا نور روز روشن میں ہوتا ہے، خدا کی قسم وہ مسلمانوں کے دلوں کو روشن کر دیتے ہیں انتہی۔ یہ وہ نور ہے جو طالبین حق کے دلوں میں ہوتا ہے جس سے ان کو سلوک میں مدد ملتی ہے اور مسالک طریقت کو روز وروشن کی طرح منور کر دیتا ہے یہ نور اس امام القلوب کا ہوتا ہے جو خدا رسیدہ ہو اور دوسروں پر اپنا اثر ڈال سکے۔ بخلاف امام اجسام کے کہ خوں ریز اور فاجر بھی ہو تو ہوسکتا ہے اس سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

پیر کامل کی معرفت اور بیعت واتباع کی ضرورت:

کلینی صفحہ ۱۰۸ میں روایت ہے ”قال ابو جعفر یا ابا حمزه یخرج احدکم فراسخ فیطلب لنفسه دلیلا و انت بطریق. السماء اجهل منک بطریق الارض فاطلب لنفسک دلیلا ”یعنی فرمایا ابوجعفر علیہ السلام نے اے ابو حمزہ تم زمین پر چند فرسخ جاتے ہو تو ایک رہبر کو ساتھ لیتے ہو حالانکہ زمین کی راہوں سے آسماں کی راہیں زیادہ تر مجہول ہیں۔ ان راہوں کی ہدایت کیلئے رہبر کی زیادہ تر ضرورت ہے اس لئے ایک رہبر اپنے لئے طلب کرو۔ مقصود یہ کہ راہ خداطلبی میں پیر کامل کی اشد

ضرورت ہے۔

کلینی صفحہ۱۰۹میں روایت ہے: **قال ابو جعفر علیہ السلام فی قولہ تعالی ﴿و نورا یمشی بہ فی الناس﴾ اماما یوتم بہ ﴿کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منھا﴾ قال الذی لا یعرف الامام** یعنی اس آیت شریفہ میں نور سے مراد امام اور مرشد ہے جس کی پیروی کی جائے اور جو مثال اس شخص کی دی گئی ہے کہ اندھیروں سے نکل نہیں سکتا اس سے مراد وہ شخص ہے جو امام کو نہ پہچانے یعنی جو شخص پیر کی تلاش نہ کرے جو اس کا مقتدا اور امام ہو سکے وہ ہمیشہ گمراہی کی تاریکی میں پڑا رہے گا۔ غرضکہ امام وہی ہے جو سالک کو راہ تحقیق میں علی وجہ البصیرت لیجا سکے۔

کلینی صفحہ۱۷۱میں مروی ہے "**عن الرضا علیہ السلام الامام واحد دھرہ لا یدانیہ احدو لا بعادلہ احد و لا یوجد منہ بدل و لا لہ مثل و لا ینظر مخصوص بالفضل کلہ من غیر طلب منہ و لا کتساب بل اختصاص من المفضل الوھاب فمن ذا الذی یبلغ معرفۃ الامام و یمکنہ اختیارہ ھیھات ھیھات ضلت العقول و جارت الالباب و اعیت البلغاء عن وصف شان من شانہ الحدیث**" حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ امام اپنے زمانے میں یگانہ اور بے نظیر ہوتا ہے اور اس کے فضائل اکتسابی نہیں ہوتے بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے اس کو خصوصیت ہوتی ہے امام کی معرفت کسی کو نہیں ہو سکتی اس کے ایک ایک وصف میں عقل حیران ہوتی ہے انتہی ۔ اس امام کو اصطلاح صوفیہ میں قطب کہتے ہیں۔ ہر چند وہ آدمیوں

میں ملے جلے رہتے ہیں مگر ان کو کوئی نہیں پہچان سکتا اور کمالات ان کے وہبی ہوتے ہیں۔ اولیاء اللہ ان سے وصول وایصال الی اللہ کے طریقے معلوم کرتے ہیں ان کو ظاہری سلطنت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چنانچہ کلینی ۱۶۷ میں لکھا ہے ''**عن المفضل عن أبی عبداللہ قال سألته عن الامام یمانی افطار الارض و هو فی بیته مرخی علیه ستره**'' دیکھئے اس سے ظاہر ہے کہ امام ابی عبد اللہ ایسے عزلت گزیں تھے کہ اکثر پردے کے اندر تشریف رکھتے تھے اب کہئے کہ ان کو سلطنت سے کیا تعلق۔

اولیاء واقطاب کا تصرف واختیار:

کلینی صفحہ ۱۲۵ میں مروی ہے ''**عن حمران قال قلت لابی عبداللہ قال اللہ عز وجل ﴿و آتیناهم ملکا عظیما﴾ قال الطاعة الحدیث** '' یعنی ابو عبد اللہ نے ﴿**و آتینا هم ملکا عظیما**﴾ کی تفسیر میں فرمایا کہ ملک عظیم سے مراد اطاعت ہے۔ مطلب یہ کہ ائمہ کرام جو انسان کامل ہیں ان کی اطاعت سب کوئی کرتے ہیں چنانچہ صوفیۂ کرام نے لکھا ہے کہ انسان کامل خلیفہ اللہ ہے اس کی اطاعت آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز کرتی ہے۔ اور ان کا تصرف تمام عالم میں جاری ہوتا ہے۔ **کما قیل: من له المولی فله الکل** ۔شعر:

تو گردن ز فرمان داور مپیچ　　　　نہ پیچند گردن ز حکم تو ہیچ

کلینی صفحہ ۱۵۰ میں مروی ہے کہ امام جعفرؓ نے فرمایا کہ جیسے آدمی ہمارے تابع ہیں ویسے ہی جنات بھی تابع ہیں جب ہمیں کسی کام میں جلدی منظور ہوتی ہے تو ہم ان کو روانہ

کرتے ہیں۔

کلینی صفحہ ۲۵۸ میں ہے عن ابی جعفر قال ’’ وجدنا فی کتاب علی ﴿ ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ و العاقبۃ للمتقین﴾ و انا واھل بیتی الذین اورثھم اللہ الارض و نحن المتقون والارض کلھا لنا ‘‘یعنی علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ زمین اللہ کی ہے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنادیتا ہے اورانجام متقیوں کے لئے ہے۔ میں اور میرے اہل بیت وہ لوگ ہیں جن کو خدانے زمین کا وارث بنادیا ہے۔ہم لوگ متقی ہیں اب پوری زمین ہماری ہے انتہی ۔

یہ تو ظاہر ہے کہ نہ علی کرم اللہ وجہہ کا قبضہ زمین شام وغیرہ پر ہوا تھا نہ حضرت کی اولا دامجاد کا‘ باوجود اس کے آپ فرماتے ہیں کہ تمام زمین ہماری ہے اس کا مطلب وہی ہے جو اولیاء اللہ نے کہا ہے کہ انسان کامل خلیفۃ اللہ ہے اور اس کا تصرف تمام عالم میں جاری ہے۔

کلینی صفحہ ۲۹۹ میں امام ابوجعفر کا قول نقل کیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ جس چیز کو خدائے تعالیٰ نے پیدا کیا ہے پرندہ ہو یا چرندہ بلکہ جس میں روح ہو وہ سب بنی آدم سے زیادہ ہماری بات سنتے ہیں اور ہماری اطاعت کرتے ہیں انتہی ۔

یہ بات اولیاء اللہ کے تجربوں اور خوارق عادات سے ثابت ہے۔اب دیکھئے یہ خلافت معنوی کے لوازم وآثار ہیں کہ باوجودیکہ انس وجن اور جمیع مخلوقات تابع فرمان تھے۔ مگر امام ابوجعفر محمد باقرؓ وغیرہ نے کبھی امارت ظاہری کا قصد نہیں فرمایا اور نہ سلطنت میں

مداخلت کی۔

کلینی صفحہ ۱۰۰ میں روایت ہے کہ احول کہتے ہیں کہ زید بن علی بن الحسین علیہما السلام نے مجھے بلوا کر اپنا ارادۂ جہاد ظاہر کیا اور مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا میں نے انکار کر کے وہ علوم بیان کئے جو علی بن حسین علیہ السلام سے مجھے اس باب میں پہنچے تھے فرمایا میرے والد مجھے اپنے ساتھ اس سفقت سے کھانا کھلاتے تھے کہ اگر بوٹی گرم ہوتی تو ٹھنڈی کر کے میرے منھ میں رکھتے کیا یہ ہوسکتا ہے کہ باوجود اس شفقت کے مجھے ایسی بات کی خبر نہ دیتے جو باعث دخول نار ہو۔ میں نے کہا آپ کو خبر نہ دینے میں بھی ایک شفقت ملحوظ تھی کیونکہ ان کو خوف تھا کہ اگر آپ قبول نہ کریں تو دوزخ میں داخل ہو جائیں گے۔ اور مجھے اس کی خبر دے دی احول کہتے ہیں کہ میں نے یہ واقعہ ابوعبداللہ سے بیان کیا آپ نے فرمایا تم نے ان کو خوب ہی تنگ کیا اور ایسا بند کیا کہ ان کو راستہ ہی نہ ملے انتھی ملخصا۔ اس سے ظاہر ہے کہ زیدؒ کا خروج کرنا اور بادشاہ وقت کا مقابلہ کرنا امام ابوعبداللہؒ کو نا گوار تھا۔

کلینی صفحہ ۲۲۴ میں روایت ہے کہ زید بن علی بن الحسین نے محمد بن علی علیہ السلام کو اہل کوفہ کے خطوط دکھا کر اپنے خروج کا ارادہ ظاہر فرمایا آپ نے ان کو بہت سمجھایا کہ اس ارادہ سے باز آؤ مگر انہوں نے نہ مانا آخر آپ نے فرمایا کہ میں خیال کرتا ہوں کہ تم مقام کناسہ میں سولی پر چڑھائے جاؤ گے اور یہ کہہ کر زار زار رونے لگے انتھی ملخصا۔ دیکھئے ائمہ کرام فساد باہمی اور سلاطین سے جنگ و جدال کو کس قدر برا سمجھتے تھے یہاں تک تو فرما دیا کہ وہ باعث دخول نار ہے اس میں شبہ نہیں کہ ان حضرات کو امامت کا دعویٰ بھی تھا۔ جیسا

کہ کلینی کی صدہا روایات سے ثابت ہے مگر یہ دعوے اگر دعوائے سلطنت سمجھا جائے تو اس کا حاصل کرنا بغیر جہاد کے ممکن نہیں‘ حالانکہ اس جہاد کو آپ حرام بتلا رہے ہیں پھر اس دعوے سے فائدہ ہی کیا زیادہ سے زیادہ اس کا اثر خیال پر پڑ سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے خوش کر دے مگر یہ حضرات ایسے نہ تھے کہ عمر بھر خیالی خوشی میں لگے رہتے۔ اصل یہ ہے کہ وہ امامت معنوی تھی جس کی حکومت سے جن وانس وغیرہ خارج نہیں ہو سکتے۔ اس امامت کو حکومت ظاہری سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ حرج اوقات سمجھ کر اس کی طرف التفات بھی نہیں کرتے تھے۔ دیکھئے ابراہیم ادہمؒ نے سلطنت کو ترک کر دیا اور وہ حکومت پائی کہ دریا کی مچھلیاں صرف ایک آواز پر حاضر ہو گئیں‘ اور امتثال امر میں کوشش کرنے لگیں۔ چنانچہ یہ حکایت مشہور اور کتب سیر میں مذکور ہے۔ جب اولیاء اللہ کا یہ حال ہو تو ائمہ کرام کا کیا حال ہونا چاہئیے۔ چونکہ لفظ امامت مشترک ہے اس لئے بعض لوگوں نے امامت ظاہری خیال کر کے یہ مشہور کر دیا کہ ان حضرات کو دعوائے سلطنت تھا۔ جو روایات ہم نقل کر رہے ہیں ان کو دیکھنے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ یہ بات مسلم ہو جائے گی کہ ان حضرات کو دعوائے سلطنت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر کسی صاحب نے جہاد کیا بھی تو سلاطین کی بداطواریاں دیکھ کر ان کی حمیت اسلامی نے جوش کیا اور اس پر ماجور ہوئے‘ جس طرح خطائے اجتہادی میں ایک ثواب ضرور ملتا ہے بشرطیکہ خالص لوجہ اللہ اور اغراض نفسانیہ سے مبّرا ہو۔

کلینی صفحہ ۱۵۳ میں یہ روایت ہے کہ ابوجعفر علیہ السلام نے فرمایا ’’ولا اعلم فی ھذا الزمان جھادا الا الحج و العمرۃ والجوار ‘‘یعنی امام ابوجعفر علیہ السلام

فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ اس زمانے میں سوائے حج وعمرہ اور اعتکاف کے کوئی اور بھی جہاد ہو۔ دیکھئے امام ابوجعفر علیہ السلام اپنے علم کی خبر دیتے ہیں جو سینہ بسینہ پہنچا تھا کہ اپنے زمانے میں جہاد درست نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر امامت بمعنی سلطنت ہوتی تو جہاد کی ضرورت بیان فرماتے کہ لڑ کر وہ حاصل کر لی جائے‘ کیونکہ سلطنت بغیر قتل وکشت کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ امامت ہی کچھ اور ہے‘ یہ ائمہ بادشاہوں کی طرح اجسام کو مسخر کرتے نہیں پھرتے تھے بلکہ زاویہ عزلت میں بیٹھے ایک عالم کے دلوں کو مسخر کر لیتے ہیں‘ ظاہر میں لوگ اس امامت اور خلافت کو کیا جانیں‘ اس کو تو وہی لوگ جانتے ہیں جن کا باطن صبغۃ اللہ سے منصبغ ہوگیا ہو۔ ان روایات سے اس حدیث کے معنی بھی معلوم ہوگئے جو کلینی صفحہ ۱۱۴ میں ہے: کان ابو عبداللہ بقول نحن ولاۃ امر اللہ و خزنۃ علم اللہ و عیبۃ وحی اللہ یعنی ابوعبداللہ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہم والیان امر الٰہی اور خزانہ داران علم الٰہی اور وحی الٰہی کی جامدانی ہیں۔

جب جہاد اور ملک گیری سے ان حضرات کو کوئی تعلق نہیں تو والیان ملک ہونے کا یہی مطلب ہوا کہ والیان ملک معنوی ہیں، ان کی اطاعت ضروری ہے اسی وجہ سے تصوف میں اطاعت پیر کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں‘ اور صاف لکھتے ہیں کہ بغیر اطاعت پیر کے اس عالم میں راستہ ملتا ہی نہیں۔

کلینی صفحہ ۱۱۲ میں مروی ہے ’’عن الحسین بن ابی العلاقال قلت لابی عبداللہ الاوصباء اطاعتھم مفترضۃ قال نعم ھم الذین قال اللہ عز وجل

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم ‘‘یعنی اس آیت شریفہ سے اوصیاء کی اطاعت فرض ہوئی جو اولی الامر ہیں۔

علم باطنی:

اگرچہ بعض علماء ظاہر بین علم باطن کا انکار کرتے ہیں، مگر مذاہب اربعہ کے محققین علماء اس کے قائل ہیں بلکہ مرید ہو کر فیوض و برکات حاصل کرتے رہے ہیں، دراصل علم باطن وہ علم ہے جو سینہ بسینہ چلا آتا ہے، ہر پیر اپنے جانشین کو علاوہ اتباع ظاہر شریعت کے خاص خاص باتوں کی وصیت کرتا ہے جو علمائے ظاہر کے مسلک کے مخالف ہیں مگر اہل طریقہ ان وصایا پر عمل کرنے کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ دراصل وہ قرآن وحدیث کے لب لباب ہیں۔

اولیاء اللہ بغیر اہلیت کے خلافت کسی کو نہیں دیتے:

کلینی صفحہ ۱۷۹ میں روایت ہے ’’عن أبی الحسن الرضا فی قول اللہ عز وجل ﴿ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا﴾ قال ھم الائمۃ یودی الامام الی الامام من بعدہ ولا یخص بھا غیرہ ولا یزویھا عنہ‘‘ یعنی حق تعالیٰ کا جو حکم ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو پہنچا دو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امام کو چاہئے کہ امامت اپنے بعد کے امام کو پہنچا دے کسی دوسرے کو نہ دے۔ اسی وجہ سے اولیاء اللہ کا دستور ٹھیرا ہوا ہے کہ بغیر اہلیت کے خلافت کسی کو نہیں دیتے اگرچہ اپنا لڑکا ہی کیوں نہ ہو، اس لئے کہ ہر کس و ناکس کو اسرار پر مطلع کرنا دین کو تباہ کرنا ہے۔ صحیح روایتوں سے ثابت ہے کہ

ابوہریرہؓ اور بعض دوسرے صحابہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں وہ علم نبی ﷺ سے پہنچے ہیں ایک وہ جو ہم ظاہر کرتے ہیں اور دوسرا اگر ظاہر کریں تو قتل کئے جائیں۔ غرضکہ جو لوگ خلافت کے اہل ہوتے ہیں انہیں کو خلافت دینا اس روایت سے ثابت ہے۔

رہا یہ کہ اکثر روایات **کلینی** سے معلوم ہوتا ہے کہ امامت کیلئے اہلبیت کا ہونا شرط ہے سو یہ درست ہے، مگر اہل بیت ہونے کے لئے یہ شرط نہیں کہ آنحضرت ﷺ ہی کی اولاد سے ہوں اس لئے کہ آنحضرت ﷺ نے سلمان فارسیؓ کو اہل بیت میں داخل فرمالیا جو فارس کے رہنے والے تھے اس سے مقصود حضرت کا ظاہر ہے کہ اہل بیت ہونے کے لئے نہ نسب کی ضرورت ہے نہ عربی ہونے کی بلکہ اگر کوئی عجمی ہو اور اس میں قابلیت ہو تو وہ اہل بیت میں شامل ہوسکتا ہے۔

کلینی صفحہ ۱۱۴ میں روایت ہے ''**عن ابی بصیر قال قلت لابی عبداللہ انما انت منذر ولکل قوم ھاد فقال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منذر و علی الھادی یا ابا محمد ھل من ھاد الیوم حتی دفعت الیک الحدیث**''

یعنی ابی بصیر کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ علیہ السلام سے آیہء موصوفہ کا مضمون پوچھا فرمایا: منذر یعنی ذرانے والے رسول اللہ ﷺ ہیں اور ہادی علی علیہ السلام تھے، فرمایا کیا آج بھی کوئی ہادی ہے؟ میں نے کہا آپ حضرات یکے بعد دیگرے ہادی ہوتے آئے یہاں تک وہ منصب اب آپ کو عنایت ہوا، فرمایا اگر آیت ایک شخص پر نازل ہو اور وہ مر جائے تو کیا آیت اور کتاب بھی مر جائے گی؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ زندہ ہے آئندہ بھی جاری

رہے گی۔انتہی۔مقصود یہ کہ اب تک جس طرح ائمہ اہل بیت یکے بعد دیگرے بغیر فوج اور طمطراق ظاہری بحالت گوشہ نشینی منصب امامت باطنی سے ممتاز رہے آئندہ بھی ایسے ہی رہیں گے کہ ان سے باطنی طور پر ہدایت ہوا کرے گی اور ظاہری جہاد وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ان کا جہاد وہی مجاہدہ ہے جس کی صوفیہ کو ضرورت ہوتی ہے۔

کلینی صفحہ ۱۷۳ میں روایت ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی وفات کے قبل آپ پر ایک کتاب نازل کی اور فرمایا کہ یہ تمہاری وصیت نجباء کی طرف ہے' آپ نے جبرئیل سے پوچھا نجباء کون ہیں؟ کہا علی اور ان کی اولاد علیہم السلام' اس کتاب پر سونے کی مہریں لگی ہوئی تھیں نبی ﷺ نے وہ کتاب علی علیہ السلام کو دے کر فرمایا کہ ایک مہر توڑ کر دیکھو اور جو کچھ اس میں ہے اس پر عمل کرو چنانچہ آپ نے اس پر عمل کیا پھر وہ کتاب امام حسن علیہ السلام کو دی انہوں نے بھی اسی کی مہر توڑ کر دیکھا اور جو کچھ اس میں لکھا تھا اور اس پر عمل کیا اسی طرح وہ کتاب امام حسین علیہ السلام اور ان کے فرزند علی اور ان کے بعد محمد بن علی اور امام جعفر صادق اور موسی کاظم علیہم السلام کو پہنچی اور سب نے جو کچھ اس میں تھا اس پر عمل کیا اور آئندہ بھی نسلا بعد نسل وہ کتاب امام مہدی علیہ السلام تک پہنچے گی انتہی ملخصا۔

امامت کیلئے سلطنت ظاہری لازم نہیں:

اس روایت سے اتنا تو ضرور ثابت ہے کہ امامت کو سلطنت لازم نہیں ورنہ کل ائمہ کرام جہاد کر کے ضرور سلطنت حاصل فرماتے جس طرح نبوت کو سلطنت لازم نہیں' اسی وجہ

سے ہزار ہا انبیاء گذرے جن کو نبوت تھی مگر سلطنت نہ تھی، بہر حال اس روایت سے ظاہر ہے کہ یہ امامت صرف پیری مریدی سے متعلق ہے جو زاویہ نشین حضرات صوفیہ کیا کرتے ہیں۔

کلینی صفحہ ۱۷۱ میں اس وصیت نامہ سے متعلق ابی عبداللہ علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے ''**فلما توفی و مضی علی بن الحسین دفعها الی محمد بن علی علیه السلام ففتح الخاتم الخامس فوجد فیها علی فسر کتاب الله و صدق آباءک وورث ابنک و اصطبغ الامه وقم بحق الله عزوجل وقل الحق فی الخوف و الامن ولا تخش الا الله ففعل**'' یعنی اس میں حکم تھا کہ حق الٰہی کے ساتھ قیام کرو اور حق بات کہو خواہ حالت خوف ہو یا امن اور سوائے خدائے تعالیٰ کے کسی سے نہ ڈرنا چنانچہ انہوں نے ویسا ہی کیا۔ دیکھئے باوجودیکہ صاف حکم تھا کہ بغیر خوف کے حق بات کہنا اور اس کی تعمیل بھی کی مگر دعوائے سلطنت نہ کیا اور اگر دعوے کرتے تو ضرور منجانب اللہ آپ کامیاب ہوتے کیونکہ بحسب روایات مسلمہ وہ وصیت نامہ حق تعالیٰ کی طرف سے بواسطہ جبرئیل علیہ السلام صادر ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ کو سلطنت ظاہری کا حکم ہی نہ تھا۔

کلینی صفحہ ۲۰۴ میں یہ روایت ہے کہ ابوالحسن علیہ السلام نے فرمایا ''**وابو محمد ابنی الخلف من بعدی فعنده علم مایحتاج الیه و معه آلة الامامة**'' یعنی میرے فرزند ابو محمد میرے بعد خلیفہ ہیں، کیونکہ ان کو مایحتاج الیہ کا علم ہے اور ان کے ساتھ

آلہ امامت بھی ہے۔ اس سے ظاہر کہ آلہ امامت آلات حرب نہیں ہیں بلکہ علم تقرب الی اللہ ہے جو مشائخین عظام کو ہوا کرتا ہے۔ **کلینی** صفحہ ۱۱۹ میں روایت ہے کہ امام رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ امامت ایک خاص رتبہ ہے جو ابراہیم خلیل علیہ السلام کو بعد نبوت اور خلت کے خاص طور پر عطا ہوا تھا' چنانچہ ارشاد ہے ﴿**انی جاعلک للناس اماما**﴾ انہوں نے کمال خوشی میں عرض کی ﴿**ومن ذریتی**﴾ یعنی الٰہی میری اولاد میں بھی امام ہوں گے۔ ارشاد ہوا ﴿**لا ینال عہدی الظالمین**﴾ اس آیت نے امامت ظالم کو ہمیشہ کے لئے باطل کردیا انتہی ملخصا۔

اس سے ثابت ہے کہ امامت ایک معنوی رتبۂ جلیل القدر ہے جو خلیل علیہ السلام کو عنایت ہوا تھا اس کو سلطنت ظاہری سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ ابراہیم و اسحاق و یعقوب علیہم السلام وغیرھم کا ائمہ ہونا اور سلاطین نہ ہونا نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔ البتہ یہ امامت فجار اور ظالمین کو نہیں مل سکتی کیونکہ وہ وہبی ہے کسبی نہیں جیسا کہ ابھی حضرت رضا علیہ السلام کے ارشاد سے ثابت ہوا۔

شان ولایت اور امامت معنوی:

کلینی صفحہ ۳۱۴ میں یاسر خادم اور ابان بن صلت سے روایت ہے کہ جب مامون کی حکومت مستقل ہوئی تو اس نے امام رضا علیہ السلام کو خراسان میں طلب کیا آپ نے بہت ٹالا مگر وہ خط پر خط روانہ کرتا گیا' یہاں تک کہ آپ مجبور ہو کر روانہ ہوئے جب مرو پہونچے تو مامون نے درخواست کی کہ آپ مسند خلافت پر متمکن ہوں مگر آپ نے انکار کیا۔ اس نے

کہا اگر خلافت قبول نہیں فرماتے تو ولیعہدی کو قبول فرما دیں۔ آپ نے اس کے لئے بھی چند شرطیں لگائیں اور لکھا کہ میں ولیعہد اس شرط پر ہوسکتا ہوں کہ کوئی حکم کروں گا نہ کسی برے کام سے منع کروں گا نہ فتوی دوں گا نہ قاضی بنوں گا نہ کسی کو منصوب کروں گا نہ معزول اور نہ کچھ تغیر وتبدل کروں گا' تمام امور سے معاف رکھا جاؤں۔ مامون نے یہ سب قبول کیا۔ یاسر کہتے ہیں کہ جب عید کا روز آیا مامون نے آپ کو کہلا بھیجا کہ سوار ہو کر عیدگاہ کو تشریف لیجائیں اور خطبہ ونماز پڑھائیں' آپ نے کہلا بھیجا کہ ہم میں اور آپ میں جو شرطیں ہوئی تھیں وہ آپ جانتے ہیں' مامون نے کہا میرا مقصود یہ ہے کہ لوگوں کے دل مطمئن ہوں اور آپ کی فضیلت سب پر ظاہر ہو جائے بہت سے سوال و جواب کے بعد آپ نے کہلا بھیجا کہ اے امیر المومنین اگر آپ اس بات سے مجھے معاف رکھیں تو بہتر ہے ورنہ میں عیدگاہ کو اس طرح جاؤں گا جیسے رسول ﷺ اور امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام جایا کرتے تھے مامون نے کہا آپ کا اختیار ہے جس طرح چاہیں تشریف لے جائیں اور چوبدار وغیرہ تزک شاہی کو حکم کر دیا کہ علی الصباح آپ کے در دولت پر حاضر ہو جائیں' یاسر کہتے ہیں کہ آپ کی سواری دیکھنے کے لئے تمام شہر کے مردوں' عورتوں اور بچوں کا ہجوم تھا آفتاب نکلتے ہی آپ اٹھے اور غسل کر کے سفید کپڑے کا عمامہ باندھا جس کا ایک پلو سینہ مبارک پر تھا اور دوسرا دونں شانوں کے بیچ میں اور دامن اٹھا کر اپنے ہمراہیوں سے فرمایا کہ جو کچھ میں کروں تم بھی وہی کرتے جاؤ۔ پھر ہاتھ میں عصا لے کر برآمد ہوئے ہم لوگ آپ کے آگے آگے چل رہے تھے اور آپ پا برہنہ تہ بند نصف ساق تک اٹھائے

ہوئے ہمارے پیچھے تھے تھوری دور چل کر آپ نے آسمان کی طرف دیکھا اور چار تکبیریں کہیں، اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسماں اور در و دیوار سے آپ کا جواب آ رہا ہے جب آپ دروازہ پر پہنچے جہاں فوج و حشم تھے کھڑے ہو گئے اور کہا ''**الله اکبر الله اکبر الله اکبر علی ماهدٰنا الله اکبر الله اکبر علی ما رزقنا من بهيمة الانعام والحمد علی ما ابلانا**'' ہم نے باآواز بلند یہ دعا پڑھی، یاسر کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ ہی مرو میں ایک کہرام مچ گیا اور زلزلہ پڑ گیا جب عہد داروں نے دیکھا کہ آپ پا برہنہ ہیں سب گھوڑوں سے کود پڑے اور اپنے موزے اتار ڈالے آپ ہر دس قدم پر توقف فرما کر تین تکبیریں کہتے جس سے تمام مرو گونج جاتا تھا جب مامون کو یہ خبر پہونچی کہ مرو میں نمونہ حشر قائم ہے اور فضل بن سہل ذوالریاستین نے بھی عرض کی کہ رضا علیہ السلام عیدگاہ تک اس طرح جائیں تو فتنہ کا اندیشہ ہے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان سے واپسی کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ مامون نے یہ درخواست کی کہ اس وقت آپ اپنے موزے منگوائیے اور سوار ہو کر واپس اپنے گھر تشریف لیجائیے انتہی۔

یہ شان ولایت اور امامت معنوی ہے کہ خلیفہ وقت منتیں منتیں کر رہا ہے کہ مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوں اور اپنے آپ کو معزول کرنے پر آمادہ ہے مگر قبول نہیں فرماتے اور ولیعہدی کو قبول بھی فرمایا تو اس شرط پر کہ امور سلطنت پر کسی قسم کی مداخلت نہ دیں گے۔ کیوں نہ ہو علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے تھے جنہوں نے فرمایا تھا کہ نعل کے تسمے کے برابر بھی سلطنت کی وقعت میرے نظروں میں نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان حضرات کو دنیا سے

ذرا بھی تعلق نہ تھا۔ پھر جو خیال کیا جاتا ہے کہ یہ حضرات سلطنت کے دالدادہ تھے اس کی تصدیق کیونکر کی جائے۔ اگر یہ بات ہوتی تو سلطنت اور خلافت حاصل کرنے کا اور کونسا موقع اس سے بہتر ہوسکتا تھا۔ غرضکہ ان حضرات کو عبادت اور زہد و ریاضت میں جو لطف آتا تھا اس کے مقابلہ میں سلطنت ہیچ و پوچ تھی۔ شعر

پس از سی سال ایں معنی محقق شد بخاقانی — کہ یکدم با خدا ابودن بہ از تخت سلیمانی

سالہائے سال کے تجربے سے محققین کو جو معلوم ہوا تھا وہ ان حضرات کے نشو و نما میں داخل تھا۔ کلینی ص ۳۳۱ میں ابوعبداللہ علیہ السلام سے روایت ہے آپ فرماتے ہیں کہ تمام خیر ایک حجرہ میں رکھی ہے اور اس کی مفتاح زہد فی الدنیا ہے انتہی۔ یعنی دنیا پر رغبت نہ کرنا ہر قسم کی خیر کو حاصل کرنا ہے۔

دنیا طلبی کا نقصان:

کلینی ص ۴۳۳ میں ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ طلب دنیا میں آخرت کا ضرر ہے اور طلب آخرت میں دنیا کا ضرر، تو ہم کو چاہئے کہ دنیا کا ضرر اختیار کرلیں کیونکہ وہ اسی لائق ہے کہ اس کو ضرر پہنچایا جائے اور اسی ص ۴۳۳ میں ہے کہ ''حب الدنیا رأس کل خطیئۃ ''یعنی دنیا کی محبت ہر گناہ کا سر ہے۔

کلینی ص ۵۲۹ میں نقل کیا ہے کہ امام علی بن الحسین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ خدا کے نزدیک کونسا عمل فضیلت میں زیادہ ہے فرمایا کہ بعد معرفت الٰہی اور معرفت رسول اللہ ﷺ کے کوئی عمل بغض دنیا سے افضل نہیں انتہی۔ یعنی دنیا سے دشمنی رکھنا تمام اعمال سے

افضل ہے اور فرمایا حب الدین راس کل خطیئۃ۔

کلینی میں یہ روایت ہے کہ ابو عبداللہ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ علی علیہ السلام کی کتاب میں لکھا ہے' کہ دنیا کی مثال سانپ کی سی ہے کہ اس کا جسم تو نہایت نرم ہے مگر اس کے باطن میں زہر بھرا ہوا ہے جو عقلمند ہے وہ اس سے بچتے رہتا ہے اور جاہل لڑکا اس کی طرف مائل ہوتا ہے۔

کلینی میں روایت ہے کہ ابو عبداللہ علیہ السلام نے کسی شخص کا ذکر فرمایا کہ وہ ریاست کو دوست رکھتا ہے' اس کے بعد فرمایا کہ وہ بھیڑئے جو شکار پر حریص ہوں بکریوں کے ایسے ریوڑ پر حملہ کریں جن کے چرواہے متفرق ہو گئے ہوں ان سے اس ریوڑ کو اس قدر نقصان نہ ہوگا جتنا حب ریاست سے مسلمان کا نقصان ہوتا ہے۔ اور سی صفحہ ۵۲۰ میں ابی عبداللہ علیہ السلام سے روایت ہے کہ ''من طلب الریاسۃ ھلک '' یعنی جس شخص نے ریاست طلب کی ہلاک ہو گیا۔

اب غور کیجئے کہ ائمہ اطہار کے پیش نظر جب یہ امور تھے اور بحسب صلاحیت فطری ان پر ان حضرات کا پورا عمل تھا اور اعلیٰ درجہ کے زاہد تھے تو کیونکر خیال کیا جائے کہ ان حضرات کو سلطنت اور دنیا طلبی مقصود تھی۔ زہد نے امام رضا علیہ السلام کو قبضہ میں آئی ہوئی سلطنت سے متنفر بنا دیا۔ علی کرم اللہ وجہہ کو قبول خلافت کے وقت اتنی شرطیں لگانے پر آمادہ کیا کہ ان کا وجود میں آنا تقریباً محال تھا۔ ہر چند یہ حضرات سلطنت اور دنیا طلبی سے متنفر تھے مگر چونکہ کمال تقدس کی وجہ سے طالبین حق جوق جوق ان حضرات کے ہاتھ پر بیعت

کرتے تھے‘اس لئے سلاطین کو یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ کہیں دعوائے سلطنت نہ کر بیٹھیں‘اسی وجہ سے درپے آزار رہتے تھے۔ چنانچہ کلینی ص ۲۹۹ میں یہ روایت ہے کہ ہشام بن عبدالملک نے ابوجعفر علیہ السلام کو زجروتوبیخ کی کہ آپ لوگ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی فکر میں ہمیشہ رہتے ہو اور اپنے آپ کو امام مشہور کرتے ہو‘ آپ نے فرمایا کہ ہم وہ لوگ ہیں کہ تمہارے اول والوں کو ہماری وجہ سے خدائے تعالیٰ نے ہدایت کی اور ہم ہی سے تمہارے اواخر کا انجام ہوگا۔ آ گر تمہارے لیے ملک معجّل یعنی ملک دنیا ہے تو ہمارے لئے ملک موجل یعنی ملک آخرت ہے اور ہمارے بعد کسی کا ملک نہ ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿والعاقبة للمتقين﴾ باوجودیکہ اس تصریح سے آپ نے آخرت کا ذکر فرمایا مگر اس نے نہ مانا اور آپ کو قید کرلیا۔ ان سلاطین کے خیال میں یہ بات جمی تھی کہ بیعت لینا بادشاہی کا کام ہے یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ خلافت ہی دوسری ہے جس میں شرط یہ ہے کہ سلطنت ظاہری اور ریاست اگر کوئی پاؤں پڑ کر بھی دے تو قبول نہ کی جائے۔ فقر و فاقہ میں ان حضرات کو وہ سلطنت حاصل تھی جو کسی بادشاہ کو نصیب نہیں۔ چنانچہ کلینی کی روایت سے ابھی معلوم ہوا کہ امام عبداللہ فرماتے ہیں: ’’نحن والاة امر الله ‘‘یعنی ہم والیان امر الٰہی ہیں۔ یہ آپ نے اس حالت میں نہیں فرمایا کہ کسی ملک یا شہر یا گاؤں کی حکومت آپ کو ملی تھی جس سے یہ خیال ہو کہ اس مقام کے والی اپنے کو تصور فرما کر کہا ہوگا بلکہ عین فقر کی حالت کے یہ ارشاد ہیں جس سے ظاہر ہے کہ ولایت اور حکومت باطنی ان حضرات کو ہمیشہ حاصل تھی۔ ورنہ جملہ اسمیہ جو دوام واستمرار پر دلالت کرتا ہے‘ صحیح نہیں ہوسکتا۔

مقصد بعثت فقط ہدایت خلق ہے:

اصل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت فقط ہدایت خلق اور خدا طلبی کی راہیں بتلانے کی غرض سے تھی اور ملک ظاہری بالتبع تھا جو اعلائے کلمۃ اللہ کے ضمن میں حاصل ہو گیا اس وجہ سے صحابہؓ جہاں جہاد کو جاتے پہلے ایمان لانے کو کہتے اور صاف کہہ دیتے کہ اگر تم ایمان لاؤ تو ہمارے بھائی ہو جاؤ گے اور تمہارے ملک سے ہمیں کوئی تعرض نہ ہوگا' چین سے اپنے ملک پر قابض رہو اور اگر کوئی تم سے مخالفت کرے تو تمہاری تائید کرنے کو موجود ہیں۔ غرضکہ بعثت نبوی ﷺ فقط ہدایت خلق کے لئے تھی اور سلطنت ظاہری بالتبع۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے خلافت ظاہری کے لئے کسی کو معین نہیں فرمایا جیسا کہ روایات سابقہ سے ظاہر ہے اور علی کرم اللہ وجہہ کے ارشاد سے بھی ابھی معلوم ہوا کہ اس کیلئے ہر برو فاجر کافی ہوسکتا ہے۔ البتہ ہدایت اور تقریب الی اللہ کا نہایت اہتمام فرمایا' چنانچہ ائمہ کرام نے بھی اسی کو اپنے ذمہ لیا۔

اولیاء اللہ ہی شیعۂ اہلبیت ہیں:

اب ہم چند ارشاد ائمۂ اطہار کے یہاں لکھتے ہیں جن سے صاف ظاہر ہوگا کہ اولیاء اللہ جو اپنی کتابوں میں اپنے حالات اور تجربے بیان کرتے ہیں یہ ائمہء اطہار ہی کی تربیت اور تعلیم کا اثر تھا اور اصل شیعہ اہلبیت کرام یہی حضرات ہیں۔

کلینی صفحہ ۶۰۴ میں روایت ہے ''**عن ابی عبداللہ قال شیعتنا الذین اذا خلوا ذکروا اللہ کثیرا** ''یعنی ابی عبداللہؑ فرماتے ہیں کہ ہمارے شیعہ وہ لوگ ہیں جو

تنہائی میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں۔اس علامت سے ظاہر ہے کہ حضرات شیعہ اہل بیت کرام اولیاء اللہ ہیں جن کا شعار ذکر الٰہی ہے چنانچہ اب تک ان حضرات کے نام لیوا اسی کام کے کہلاتے ہیں اور بیعت لیتے وقت ذکر الٰہی کی ہی ہدایت اور تعلیم کرتے ہیں۔

کلینی صفحہ ۴۰۲ میں روایت ہے عن جابر عن ابی جعفرؑ قال قال لی یا جابر اکتفی من ینتحل العشیع ان یقول یحبنا اهل البیت فوالله ما شیعتنا الا من اتقی الله و اطاعه و ما کانوا یعرفون یا جابر الا بالتواضع والتخشع والا مانة و کثرة ذکر الله و الصوم و الصلوة والبربالو الدین و تعاهد الجیران من الفقر و اهل المسکنة و الغارمین والا یتام و صدق الحدیث و تلاوة القران و کف الالسن عن الناس الا من خیر و کانوا امناء عشائر هم فی الاشیاء قال جابر فقلت یا ابن رسول الله ما نعرف الیوم احدا بهذه الصفة فقال یا جابر لا تذهبن بک المذاهب حسب الرجل ان یقول احب علیا علیه السلام و اتولاه ثم لا یکون مع ذلک فعالا فلو قال انی احب رسول الله فرسول الله خیر من علی ثم لا یتبع سیرته و لا یعمل نسبته ما نفعه حبه ایاه شیئا و اتقو الله و اعملوا لما عند الله لیس بین الله و بین احد قرابة احب عباد الله الی الله عز وجل اتقاهم و اعملهم بطاعة یا جابر والله مایتقرب الی الله تبارک و تعالیٰ الا بالطاعة وما معنا براءة

من النار ولا علی اللہ لا حد من حجة من کان للہ مطیعا فھو لنا ولی و من کان للہ عاصیا فھو لنا عدو و ما تنال و لا یتنا الا بالعمل والورع ''۔ترجمہ:

جابر کہتے ہیں کہ ابوجعفرؒ نے مجھ سے فرمایا کہ اے جابر کیا کافی ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص تشیع کو اپنا مذہب قرار دے کر کہے کہ میں اہل بیت کو دوست رکھتا ہوں۔ خدا کی قسم ہمارے شیعہ وہی ہیں جو خدا سے ڈرتے ہیں اوراس کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان کی شناخت ان امور سے ہوتی ہے کہ ان میں تواضع اور خشوع ہواور صوم وصلوۃ اور ذکرالٰہی کثرت سے کریں اور اپنے ہمسایہ فقراء اور مساکین اور قرضداروں اور یتیموں کی خبرگیری کیا کریں' سچی بات کہیں' قرآن پڑھا کریں' برائی سے کسی کا ذکر نہ کریں' جب کسی کا ذکر کریں تو بھلائی سے کریں' اپنے قبائل میں امانتدار ہوں۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا ابن رسول اللہ یہ صفات تو ہم نے کسی شیعی میں نہیں دیکھے۔ فرمایا اے جابر کیا تم خیال کرتے ہو کہ کوئی کہے کہ میں علی علیہ السلام کو دوست رکھتا ہوں اور یہ سب کام نہ کرے' کیا اس کو کافی ہوسکتا ہے؟ علی علیہ السلام تو کیا اگر کوئی کہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کو دوست رکھتا ہوں جو علی علیہ السلام سے بہتر تھے پھر ان کی سیرت کا اتباع اور سنت پر عمل نہ کرے۔ اس کو بھی حضرت کی محبت کچھ نفع نہ دے گی۔ چاہئے تم لوگ اللہ سے ڈریں اور عمل کریں۔ خدا سے کسی کو قرابت نہیں سب سے زیادہ خدا کا دوست وہی بندہ ہے جو سب سے زیادہ متقی اور مطیع ہو۔ اے جابر خدا کی قسم خدا کا تقرب بغیر اطاعت کے حاصل نہیں ہوسکتا۔ ہمارے پاس دوزخ کی براءت نہیں ہے اور خدا پر کسی کی حجت قائم نہیں ہوسکتی' جو شخص خدا کا مطیع ہو وہی ہمارا دوست ہے اور جو خدا کا نا

فرمان ہے وہ ہمارا دشمن ہے۔ بغیر عمل اور ورع کے ہماری دوستی حاصل نہیں ہو سکتی انتہی۔

دیکھئے جابرؓ نے صاف عرض کر دیا کہ جو لوگ شیعیت کا دم بھرتے ہیں ان میں تو کوئی بھی ایسا نہیں کہ جس میں یہ صفات پائی جائیں۔ اب دیکھنا چاہئے کہ یہ صفات کس جماعت میں ہیں یوں تو تمام فرق اسلامیہ میں ان صفات کی ضرورت بیان کی جاتی ہے مگر جس قدر اہتمام اور التزام عملی طور پر حضرات صوفیہ کرتے ہیں کسی دوسرے فرقہ میں نظر نہ آئیگا۔

''قوت القلوب'' اور ''رسالہ قشیریہ'' اور ''احیاء العلوم'' وغیرہ کتب صوفیہ کے دیکھنے سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو انہیں کاموں میں وقف کر دیا تھا۔ اس حدیث پر اور ان حضرات کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ بات مبرہن ہو جائے گی کہ اصول تصوف یہی ہیں جو اس حدیث میں مذکور ہیں جن پر ان حضرات نے پورا پورا عمل کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر الفاظ اور اصطلاح سے قطع نظر کیا جائے تو حقیقی شیعہ صوفیہ کرام ہیں۔

کلینی ص ۴۹۴ میں مھزاسدی سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ ابو عبداللہؒ نے فرمایا کہ ہمارے شیعہ وہ ہیں کہ کتے کی طرح روتے نہیں اور کوے کی طرح طمع نہیں کرتے اور ہمارے دشمنوں سے کچھ نہیں مانگتے اگرچہ مر جائیں۔ میں نے کہا ایسے لوگوں کو کہاں ڈھونڈوں۔ فرمایا اطراف زمین یعنی جنگلوں اور پہاڑوں میں' ان لوگوں کی معیشت بہت کم درجہ کی ہے' مقامات ان کے بدلتے رہتے ہیں۔ اگر وہ شہروں میں آ جائیں تو کوئی ان کو نہ پہچانے اور اگر چلے جائیں تو کوئی ان کو ڈھونڈھتا نہیں' موت سے وہ گھبراتے نہیں' قبرستان

میں وہ باہم ملاقات کرتے ہیں' اگر کوئی محتاج ان کے پاس آجائے تو وہ اس پر رحم کرتے ہیں۔ان کے دلوں میں اختلاف نہیں اگرچہ مختلف مقامات کے ہوں انتھی ملخصا۔

کتب صوفیہ اور''حلیۃ الاولیاء''ابونعیمؒ جو کتب حدیث میں مشہور کتاب ہے اور دیگر تراجم اولیاء اللہ دیکھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ یہی حضرات ان صفات کے ساتھ متصف تھے صوفیہ میں جو حضرات درجہءکمال اور ولایت کو پہنچے وہ نتیجہ انہیں اعمال اور ریاضتوں کا تھا۔

حصول ولایت:

کلینی ص۴۰۳میں ہے کہ ابوجعفر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ **و ماتنال ولا یتنا الا بالورع و العمل** یعنی بغیر ورع اور عمل کے ہماری ولایت حاصل نہیں ہوسکتی انتھی۔اس ارشاد سے ظاہر ہے جو سنا جاتا ہے کہ سوائے ائمہ کرام کے کوئی ولی نہیں ہوسکتا' وہ بے اصل بات ہے کیونکہ ائمہ کرام کی تصریح سے ثابت ہے کہ جو ورع اور عمل کرے بفضل الٰہی اس ولایت کو حاصل کرسکتا ہے جس کے ساتھ وہ حضرات متصف تھے۔

سکوت:

کلینی ص۴۲۴ میں ہے۔''**عن ابی حمزۃ قال سمعت ابا جعفر علیه السلام ان شیعتنا الخرس** ''یعنی ابوجعفر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہمارے شیعہ گونگے ہوتے ہیں انتھی۔

حضرات صوفیہ کا بھی قول ہے''**من عرف الله کلّ لسانه**''

روافض کی شیعیت ومحبت کا انکار:

کلینی صفحہ ۳۹۹ میں ہے: روی عن علی بن ابی محمد رفعه قال قلت لابی عبدالله علیه السلام ان قوما من موالیک یلمون بالمعاصی و یقولون نرجوا' فقال کذبوا لیسوا بموال' اولئک قوم ترجحت لهم الامانی' من رجا شیئا عمل له و من خاف شیئا هرب منه ''یعنی ابی عبداللہ علیہ السلام سے کہا گیا کہ آپ کے دوست شیعہ گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور کہتے ہی کہ ہمیں خدا سے امید ہے' فرمایا وہ جھوٹے ہیں ہمارے دوست نہیں'۔ ہوس ان لوگوں پر غالب ہوگئی ہے۔ جو شخص کسی چیز کی امید رکھتا ہے اس کیلئے عمل کرتا ہے اور جو کسی چیز سے ڈرتا ہے اس سے بھاگتا ہے انتہی۔

دیکھئے معمولی لوگوں کو جو گناہوں کی چنداں پرواہ نہیں کرتے شیعہ سے خارج فرمادیا اور اپنے موالی میں انہیں حضرات کو شریک فرمایا جو عبادہ زہاد ہیں۔

معیار فضیلت تقوی ہے:

کلینی صفحہ ۵۳۴ میں ابوجعفر علیہ السلام کا ارشاد منقول ہے ''لیس لا حد فضل الا بالتقوی ''یعنی کسی کو کسی پر فضیلت نہیں مگر تقوی کی وجہ سے۔ آپ نے قاعدہ کلیہ فرمادیا کہ جو تقوی کرے وہی افضل ہے۔ حق تعالی فرماتا ہے ﴿ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم﴾

توجہ الی اللہ:

کلینی صفحہ ۴۹۸ میں فضل بن یسار سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں ابوعبداللہ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا جب آپ کو مرض موت لاحق تھا' آپ نے فرمایا اے

فضل اگر خدائے تعالی کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر دنیا کی قدر ہوتی تو اپنے دشمن کو اس سے ایک پیالہ پانی کا نہ پلاتا اور فرمایا اے فضل جس کی توجہ ایک ہی طرف ہو یعنی خدائے تعالی کی طرف تو وہ اس کے تمام حاجتوں میں کافی ہوتا ہے اور جس کی توجہ ہر طرف ہو وہ جس وادی میں ہلاک ہو جائے خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں انتہی ۔

یہ آپ کی آخری نصیحت حضرات شیعہ کو تھی جس پر اولیاء اللہ نے پورا عمل کیا اور دنیا سے منہ مور کر ایک ہی کام کے ہو رہے، ایسے حضرات جس زمانے میں نظر آئیں گے صوفیہء کرام ہی ہوں گے۔ کیونکہ ان کے مذہب کی بنیاد اسی قسم کے امور پر ہے۔ ہر چند کہنے کو تو سب یہی کہتے ہیں کہ بندہ کو خدا کی طرف پوری توجہ چاہئے مگر جب اپنے حالات کی تفتیش کر کے اولیاء اللہ کے حالات کے ساتھ مقابلہ اور موازنہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔

کلینی صفحہ ۴۹۶ میں ابو عبد اللہ علیہ السلام کا ارشاد منقول ہے ''المومنة اعز من المومن والمومن اعز من الكبريت الاحمر فمن راى منكم الكبريت الاحمر ؟'' یعنی ایمان دار عورت ایمان دار مرد سے زیادہ نادر الوجود ہے، اور ایمان دار مرد کبریت احمر سے بھی زیادہ نادر الوجود ہے، تم میں سے کسی نے کبریت احمر دیکھی ہے؟ انتہی ۔

اخفائے اسرار سینہ بسینہ :

مومنین سے مراد کامل الایمان حضرات ہیں ان کی بھی یہی حالت ہے کہ کبریت

احمر سے بھی زیادہ نادر الوجود ہیں' اسی وجہ سے اسرار باطنی جو سینہ بسینہ ان حضرات کو پہنچے ہیں یا الھامی طور پر من جانب اللہ ان کا القا ہوا تھا وہ ہر کسی کو بتلاتے نہ تھے' اس لئے کہ ہر کسی میں صلاحیت نہیں۔

کلینی صفحہ ۴۹۶ میں ہے ''عن ابن رباب قال سمعت ابا عبداللہ علیه السلام یقول لابی بشیر اما واللہ لو اطاع احد منکم ثلثة مؤمنین یکتمون حدیشی ما استحلک أن أکتمهم حدیثا ''یعنی ابا عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا خدا کی قسم اگر میں تم لوگوں میں سے تین شخص ایسے ایماندار پاتا جو میری بات کو چھپا سکیں تو کسی بات کو چھپانا حلال نہ سمجھتا انتہی۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابو عبداللہ علیہ السلام اپنے معمولی ملنے والوں کو اسرار باطنی سے کوئی بات نہیں بتائی اور کیونکر بتاتے' ان لوگوں کو اسرار لہی سے تعلق ہی کیا' وہاں تو خاص غرض یہی تھی کہ محبت اہل بیت کرام کو تحصیل سلطنت کا ذریعہ بنائیں' اس وجہ سے ان حضرات نے کسی موقع میں تصریح بھی کر دی کہ یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں جیسا کہ ابھی معلوم ہوا اور دوست فرمایا تو ان لوگوں کو جو پہاڑوں اور جنگلوں میں رہ کر عبادت الٰہی میں مشغول ہیں۔

تقیہ کا اصل راز:

چونکہ ان لوگوں کا خیال یہی تھا کہ یہ حضرات بھی اپنی طرح طالب ریاست ہیں اسلئے اخفائے اسرار کا مطلب یہ سمجھا کہ اگر اپنا ارادۂ خروج' بادشاہوں کو معلوم ہو جائے تو قتل ہی کر ڈالیں گے۔ اس وجہ سے کسی ملنے والے پر بھروسہ نہ کرے کے تقیہ کیا کرتے اور

اپنے دل کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتے حالانکہ یہ حضرات راہ خدا میں جان دینے کو شہادت سمجھتے اور کسی سے خوف نہیں کرتے تھے۔

حد توکل ویقین:

کلینی صفحہ ۳۹۴ میں ابی بصیر سے روایت ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہر چیز کیلئے ایک حد مقرر ہے؟ میں نے عرض کی توکل کی کیا حد ہے فرمایا یقین' پھر میں نے عرض کی یقین کی کیا حد ہے؟ فرمایا **الا تخاف مع الله شيئا** یعنی باوجود خدائے تعالیٰ کے کسی چیز کا خوف تمہیں نہ ہو۔ اب کہئے کہ کیا ان حضرات کا یقین ایسا بودا ہوسکتا ہے کہ بادشاہ تو بادشاہ اپنے رفقا سے یہ خوف کرتے ہوں کہ کہیں گرفتار نہ کرادیں۔

کلینی صفحہ ۳۹۴ میں مروی ہے ''**كان امير المومنين يقول لا يجد عبد طعم الايمان حتى يعلم ان ما اصابه لم يكن ليخطاه و ان ما اخطاه لم يكن ليصيبه و ان الضارو النافع هو الله عزوجل**''۔ یعنی علی علیہ السلام فرماتے تھے کہ کوئی بندہ ہرگز ایمان کا ذائقہ نہیں چکھ سکتا جب تک کہ یقیناً نہ جان لے کہ جو کچھ مصیبت اسے پہنچی ہے وہ کبھی ٹل نہیں سکتی تھی اور جو ٹل گئی وہ کبھی نہیں پہنچ سکتی تھی اور نفع اور ضرر دینے والا فقط خدائے عزوجل ہے۔ انتہی۔ دیکھئے جب تک نافع اور ضار خدائے تعالیٰ نہ سمجھا جائے ایمان کا ذائقہ ہی حاصل نہیں ہوسکتا تو ان حضرات کامل الایمان کے نسبت یہ کیونکر خیال کیا جائے کہ اپنے رفقاء کو ضار سمجھ کر تقیہ کرتے ہوں گے' پھر ان حضرات کو موت سے خوف ہی کیا وہ صادق تھے اس لئے موت کی تمنا کیا کرتے تھے۔ **کما قال تعالی**

﴿فتمنوا الموت ان کنتم صادقین﴾ وہ جانتے تھے کہ ”الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب“ ابھی معلوم ہوا کہ شیعہ کے اوصاف میں یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ موت سے گھبراتے نہیں پھر کیونکر ہوسکتا ہے کہ خود گھبراتے ہوں۔ غرضکہ یہ اسرار کچھ اور ہی تھے۔ مگر لوگوں نے طلب ریاست سے اسے متعلق کردیا۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست کلینی صفحہ ۵۴۴ میں روایت ہے ابو جعفر علیہ السلام سے آپ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے شب معراج میں پوچھا کہ یارب تیرے نزدیک مومن کا کیا حال ہے؟ ارشاد ہوا اے محمد ﷺ جو میرے ولی کی اہانت کرے وہ میرے مقابلہ کے لئے میدان میں آ کھڑا ہو' میں اپنے اولیاء کی نصرت بہت جلد کرتا ہوں' مجھے کسی بات میں ایسا تردد نہیں ہوتا جیسے اس مومن کی وفات کے وقت ہوتا ہے جو موت کو مکروہ سمجھتا ہے اور میں اسے رنجیدہ کرنا مکروہ سمجھتا ہوں۔ بعض میرے بندے مومن ایسے ہیں کہ ان کے حق میں تونگری اصلح ہے۔ اگر میں انہیں فقیر بنادوں تو وہ ہلاک ہوجائیں گے اور بعض کے حق میں فقر اصلح ہے' اگر میں ان کو غنی کردوں تو وہ ہلاک ہوجائیں گے۔ میرے تقرب کے لئے فرائض سے زیادہ کوئی چیز مجھے محبوب نہیں اور بندہ نوافل ادا کرکے مجھ سے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اسے دوست رکھتا ہوں پھر جب میں دوست رکھتا ہوں تو میں اس کی سماعت ہوجاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور بصارت ہوجاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور زبان ہوجاتا ہوں جس سے وہ بات کرتا ہے اور ہاتھ ہوجاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اگر وہ مجھے پکارتا ہے تو میں اس کا جواب دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے عطا کرتا ہوں۔ انتہی۔

یہ روایت فقط حضرات شیعہ ہی کی کتابوں میں نہیں بلکہ اسی مضمون کی روایت اہل سنت کے کتب صحاح میں بھی موجود ہے۔ غرضکہ اسرار یہ ہیں کہ جن کا مطلب سمجھنا مشکل اور بیان کرنا متعذر رہے۔ ابتدائے سلوک سے اس درجہ کو پہنچنے تک اقسام کے واردات اور مشاہدات سالک کو پیش آتے ہیں جو بیان کئے جائیں تو بادی النظر میں قابل تکفیر معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ان امور کا اظہار کیا جائے تو شریعت میں رخنہ پیدا ہوتا ہے' اس لئے ائمہء کرام ان کے اخفا میں کمال درجہ کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ مگر جو لوگ ان اسرار سے واقف نہیں انہوں نے سمجھ لیا کہ خانگی امور میں ائمہ تقیہ کیا کرتے ہیں۔

شریعت کی توہین کفر ہے:

کلینی صفحہ (۵۵۲) میں روایت ہے کہ ابو عبداللہ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ سر کا شائع کرنے والا شکی ہے اور جو اس کا اہل نہ ہو اس کے روبرو ظاہر کرنے والا کافر ہے اور جو شخص عروۂ وثقی کو مضبوط پکڑے اس کو نجات ہے۔ نضر جو راوی حدیث ہیں کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا عروۂ وثقی کیا ہے؟ فرمایا تسلیم انتہی۔ یعنی جو کچھ پیر کامل نے بیان کیا وہ قبول کر لیا جائے۔ ائمۂ کرام جو مکاشفات اور مشاہدات بغرض تعلیم مریدوں سے بیان فرماتے تھے کہ سالک کو ایسے ایسے امور پر اطلاع ہوا کرتی ہے بعض لوگ سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے کسی ذی علم کے روبرو اس غرض سے بیان کر دیتے تھے کہ شاید وہ کسی قسم کی توجیہہ کر کے سمجھا دے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کو مرشد کے کلام میں شک ہے' اس لئے صاف فرما دیا کہ اسرار کو شائع کرنے والا شکی ہے اور نا اہل کے روبرو بیان کرنا' اس وجہ سے کفر ہوگا کہ اس قسم

کی باتوں کو منکر وہ خود بھی گمراہ ہوگا اور لوگوں کو بھی گمراہ کرے گا۔ چنانچہ بعض متصوفہ کا حال دیکھا جاتا ہے کہ تصوف سے استدلال کر کے نماز و روزہ وغیرہ وامر و نواہی کو معاذ اللہ فضول بتاتے ہیں اور شریعت کی توہین کرتے ہیں جو یقیناً کفر ہے۔ غرضکہ مرید صادق کو ضرور ہے کہ ان اسرار کو جو پیر کامل بیان کرے تسلیم کر لے اور فرائض اور کثرت نوافل سے تقرب الٰہی حاصل کرتا جائے تا کہ اس کو بھی وہ درجہ حاصل ہو جس کا حال حدیث قدسی میں مذکور ہوا کہ خدائے تعالیٰ اس کی سمع، بصر وغیرہ ہو جاتا ہے۔

طینت اولیاء طینت اہلبیت ہے:

کلینی صفحہ (۲۵۵) میں روایت ہے کہ ابو عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک ایک سِرّ ہے اسرار الٰہی سے، جس کے پہنچانے کے ہم مامور ہیں چنانچہ وہ ہم نے پہنچا دیا مگر ہم نے نہ اس کا محل پایا نہ اس کے اہل نہ اس کو اٹھانے والے یہاں تک کہ ایسے لوگوں کو خدائے تعالیٰ نے پیدا کیا جن کی تخلیق طینت محمد ﷺ اور ان کی آل اور ذریت کی طینت سے ہوئی اور اس نور سے پیدا ہوئی جس سے محمد ﷺ اور ان کی آل و ذریت پیدا ہوئی، چنانچہ انہوں نے قبول کیا انتہی۔

یہ وہی حضرات راسخ الاعتقاد ہیں جنہوں نے پیران عظام کے ارشادات کو تسلیم کر کے تصوف میں علماً و عملاً کمال پیدا کیا اور اسرار و انوار حاصل کئے اور ائمہ کرام نے ان کی تعلیم معنوی میں دلدہی کی۔

تقیہ کی حقیقت:

کلینی صفحہ (۴۸۵) میں روایت ہے کہ ابو عبداللہ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ تقیہ مسلمانوں کی سپر اور ایمان کا بچاؤ ہے۔ جس نے تقیہ نہیں کا اسے ایمان ہی نہیں، ہماری کوئی بات اگر کسی کو معلمو ہوئی اور وہ اس کو پوشیدہ رکھا تو وہ دنیا میں عزیز ہوگا اور آخرت میں اس کے لئے نور ہوگا۔ اگر اس کو شائع کیا تو دنیا میں ذلیل ہوگا اور وہ نور خدائے تعالیٰ اس سے چھین لے گا انتہی۔

غرضکہ اسرار طریقت چھپانے کی نہایت تاکید ہے اور اسی کا نام تقیہ ہے کیونکہ اگر وہ نہ چھپائے جائیں تو وہی اسرار جو نتیجہء قرب الٰہی تھے باعث الحاد و زندقہ ہو جاتے ہیں، اسی وجہ شیخ محی الدین ابن عربیؒ وغیرہ اکابر محققین نے تصریح کردی ہے کہ ہر کوئی ہماری کتابیں دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا، اس لئے ایسے لوگوں پر ان کتابوں کا دیکھنا حرام ہے۔

اخفائے اسرار واحادیث:

بخاری شریف (کتاب العلم) میں رویت ہے ''عن ابی هريرةؓ قال: حفظت من رسول ﷺ و عائين: فاما احدهما فبثثته، و اما الآخر فلو يثثته قطع هذا البلعوم ''یعنی ابی ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ سے مجھے دو قسم کے علم پہنچے ہیں: ایک وہ کہ میں اسے شائع کرتا ہوں، دوسرا وہ ہے کہ اگر اس کو شائع کروں تو میرا گلا کاٹا جائے گا۔ حلیۃ الاولیاء میں ابونعیم سے ابوہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے پانچ جراب علم پہنچائے یعنی پانچ کشتیاں: اس میں سے دو جراب میں نے ظاہر کئے، اگر تیسرا جراب ظاہر کروں تو تم لوگ مجھے رجم کرو گے۔ حلیۃ الاولیاء میں روایت ہے کہ

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اگر میرے تمام علم پر تم مطلع ہو جاؤ گے تو میرے سر پر خاک ڈالو گے۔

اسرار طریقت چھپانے کی تاکید:

حلیۃ الاولیاء میں ابو حذیفہؓ کا قول مروی ہے اگر میں چاہوں تو ہزار باتیں ایسی بیان کروں کہ تم ان کی تصدیق کرو گے' بلکہ میرے ہاتھ پر بیعت کر کے میری مدد کرو گے۔ اور ہزار باتیں ایسی بیان کر سکتا ہوں کہ تم ان کی تکذیب کر کے مجھ سے بیگانگی اختیار کر سکو گے اور گالیاں دو گے حالانکہ وہ بھی صدق اور خدا اور رسول ہی کے اقوال ہیں۔

حلیۃ الاولیاء میں عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ قرآن سات حرف پر نازل ہوا ہر حرف کے لئے ظاہر و باطن ہے اور علی کرم اللہ وجہہ کو اس کے ظاہر اور باطن کا علم ہے۔

جامع صغیر میں علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ علم باطنی اسرار الٰہیہ سے ایک سر ہے' خدائے تعالیٰ جس بندہ کو چاہتا ہے اس کے دل میں وہ ڈال دیتا ہے۔

فتوحات مکیہ کے تیسویں (۳۰) باب میں ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ اس میں کثرت سے علوم بھرے ہیں' کاش میں ایسے شخصوں کو پاتا جو ان کا بار اٹھا سکیں۔ اور جنید بغدادیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ کوئی شخص درجہ حقیقت تک نہیں پہونچ سکتا جب تک ہزار صدیق اس کے زندیق ہونے پر گواہی نہ دیں۔ اور عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ ﴿ اللہ الذی خلق سبع سمٰوات و من الارض مثلھن یتنزل الامر بینھن ﴾ اس کی تفسیر اگر میں بیان کروں تو تم لوگ

مجھے رجم کرو گے اور ایک روایت میں ہے کہ کافر کہو گے۔ اور امام علی بن الحسین زین العابدینؓ یہ اشعار پڑھتے تھے:

یا رب جوھر علم لو ابوح به لقیل لی انت ممن یعبد الوثنا

ولا ستحل رجال مسلمون دمی یرون اقیح ما یأتونه حسنا

یعنی اگر میں جوہر علم بیان کروں تو مسلمان لوگ مجھے بت پرست کہیں گے اور مجھے قتل کر کے کہیں گے ہم نے یہ اچھا کام کیا۔

طبقات میں امام شعرانیؒ نے لکھا ہے کہ جنید بغدادیؒ شبلیؒ سے کہا کرتے تھے کہ سرّ الٰہی کا افشا محجوبین میں نہ کرنا۔

طبقات میں ابوعمرو عثمان بن مرزوقؒ کے حال میں لکھا ہے کہ ان کے مریدوں نے ایک ایک روز بالاتفاق کہا: آپ حقائق میں گفتگو نہیں کرتے' فرمایا آج میرے اصحاب کتنے ہیں کہا (۶۰۰) فرمایا ان میں سے سو کا انتخاب کرو اس کے بعد فرمایا ان میں سے بھی بیس کا انتخاب کرو پھر فرمایا کہ ان میں سے بھی چار شخصوں کو منتخب کرو جو تمام مریدوں میں اعلیٰ درجہ کے باخدا اور مرتاض ہوں۔ چنانچہ ابن العسقلانی وغیرہ منتخب کئے گئے فرمایا اگر حقائق کی ایک بات ان سے کہوں تو یہی چار حضرات سب سے پہلے میرے قتل کا فتویٰ دیں گے۔ یہی بات ہے جو کلینی صفحہ ۲۲۱ میں ابوالحسن موسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے ''فان اذاعوافھو الذبح واشار بیدہ الی حلقہ'' یعنی اگر لوگوں نے ہمارے اسرار کو ظاہر کر دیا تو ہمارا گلا کاٹا جائیگا۔ جو ابوہریرہؓ نے بھی یہی فرمایا تھا کہ راز کی باتیں بیان کروں تو میرا گلا کاٹا جائے گا۔

الحاصل علوم اسرار کا جو دسنیوں کی بخاری وحلیۃ الاولیاء وغیرہ سے اور حضرات شیعہ کی کلینی وغیرہ سے ثابت ہے کسی فرقہ کو اس سے انکار نہیں ہوسکتا البتہ علمائے ظاہر اور حضرات شیعہ کو تعین مصداق میں کلام ہے اور اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ جن ریاضات و مجاہدات سے یہ علم حاصل ہوسکتا ہے وہ ان حضرات سے تو ہو نہیں سکتے۔ آخر بمصداق ''**الانسان عدو ماجهل**'' اس فن کے دشمن ہی ہوگئے اور انگور کھٹے ہیں کی مثل صادق آگئی۔ اور جن علماء نے مثل امام غزالی وغیرہ مجاہدات کئے وہ کامیاب ہوئے جیسا کہ ان کی تصانیف سے ظاہر ہے جو لوگ اپنے آپ کو شیعہ ءائمہ کرام میں شریک کرتے تھے حالانکہ وہ دراصل شیعہ نہیں تھے جس کا حال ائمہ ءکرام کی تصریح سے ابھی معلوم ہوا' انہوں نے اخفائے اسرار کا مطلب تقیہ قرار دیا اور اس کو نبی کریم ﷺ سے شروع کیا کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے خوف کے مارے علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ نہ بنا سکے اور تنہائی میں ان کی تسلی کے لئے ایسی باتیں کہتے تھے کہ اگر وہ ظاہرا بیان کرتے تو فتنہ کا خوف تھا کیوں کہ وہ دونوں صاحب اگر بگڑ جاتے تو سب معاملہ ءنبوت معاذ اللہ درہم و برہم ہو جاتا پھر علی کرم اللہ وجہہ نے خلفائے ثلثہ کے ہاتھ پر جو بیعت کی وہ بھی تقیہ تھا اور اس کے سواء جتنی روایتوں میں علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر ائمہ ءکرام کا خلفائے ثلثہ کی مدح کرنا ثابت ہے وہ سب تقیہ تھا جن کا مطلب یہ کہ ائمہ کرام کا کوئی قول و فعل قابل اعتماد نہیں اور معاذ اللہ ان حضرات کے کاروائیاں اس قابل تھیں کہ مخالفین ان کو منافقانہ سمجھیں۔ **نعوذ باللہ من ذلک۔**

الحاصل تقیہ سے مقصود ائمہ ءاکرام کا اخفائے اسرار تھا کہ سالکین راہ طریقت و

حقائق پر وقتاً فوقتاً منکشف ہوتے رہتے ہیں جس کا بیان عام مسلمانوں کو ضرر رساں ہے اور کلینی صفحہ ۴۲۵ میں روایت ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے علی بن حسین علیہما السلام سے تقیہ کا ذکر کیا' فرمایا خدا کی قسم اگر ابوذرؓ کو وہ علوم معلوم ہوتے جو سلمان فارسی کو معلوم تھے ان کو قتل کر ڈالتے حالانکہ رسول ﷺ نے ان دونوں میں مواخاۃ قائم کی تھی۔

جب ان لوگوں کا یہ حال ہو تو دوسروں کا کیا ہوگا۔ علماء کا علم بہت سخت ہے سوائے نبی مرسل یا ملک مقرب یا اس مومن کے جس کے دل کو خدا نے آزمالیا ہو کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ تقیہ سے مراد ان علمی اسرار کا چھپانا ہے جو علماء باللہ پر منکشف ہوتے ہیں۔ غرضکہ ائمہ اطہار کے وہی اصول تصوف ہیں جن پر اولیاء اللہ کار بند ہیں اگرچہ کہ احادیث مذکورۂ بالا سے بھی یہ مطلب ثابت ہے مگر اور چند احادیث یہاں لکھے جاتے ہیں جن سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہو جائے گی۔

مومن کے امتیازی صفات:

کلینی صفحہ (۴۸۸) میں یہ روایت ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام ایک روز خطبہ پڑھ رہے تھے' عین خطبہ میں ہمام نے پوچھا کہ مومن کے ایسے صفات بیان فرمائے کہ وہ ممتاز ہو جائے' فرمایا اے ہمام وہ ایک سمجھدار شخص ہوتا ہے جس کا چہرہ تر و تازہ ہوتا ہے مگر دل میں حزن بھرا ہوا' سب سے زیادہ وہ اپنے نفس کو ذلیل سمجھتا ہے' جو چیز فنا پذیر ہو اس سے نفس کو زجر اور ہر اچھی چیز کی طرف اس کو راغب کرتا ہے' وہ نہ کسی سے کینہ رکھتا ہے نہ

حسد، نہ کسی کو گالی دیتا ہے نہ کسی کا عیب بیان کرتا ہے، اپنی رفعت کو مکروہ سمجھتا ہے، اکثر خاموش اور خدائے تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہتا ہے، صابر شاکر اپنی فکر میں مغموم اور اپنے فقر کے ساتھ خوش، اس سے اذیت بہت کم پہنچتی ہے، غصہ کی حالت میں وہ نہایت نرم، محبت اس کی خالص، وعدہ اس کا مضبوط، اپنی خواہشوں کے مخالف، اپنے ماتحت پر رحم دل لا یعنی باتوں میں خوض نہیں کرتا، خرچ بہت کرتا ہے مگر بلا اسراف، خلق اللہ پر نرمی کرنے والا ضعیفوں کا مددگار، کسی کی پردہ دری نہیں کرتا بھید کو چھپا رکھتا ہے اگر خیر کسی سے دیکھتا ہے تو اس کا ذکر کرتا ہے اور شر دیکھتا ہے تو اس کو چھپاتا ہے، کسی سے لغزش اور قصور ہو تو معاف کر دیتا ہے، عذر کو قبول کرتا ہے، لوگوں کے ساتھ نیک گمان بدگمانی سے دور دوستی رکھتا ہے تو اللہ کے واسطے برائی کا بدلہ نہیں لیتا اس کا عفو دشمنی پر غالب خدائے تعالیٰ کا فرمانبردار اور ہر حال میں اس سے راضی، سر و علانیہ میں لوگوں کا خیر خواہ، امید اس کی بہت تھوڑی جو کچھ مل گیا اس پر قانع لوگ اس سے راحت میں اگر کوئی اس پر بغاوت کرے تو وہ صبر کرتا ہے اور گذشتہ اہل خیر کا مقتدی اور آنے والے اہل بر کا وہ امام ہوتا ہے۔ انتہی ملخصا۔

اب کہئے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے مومن کو جو ممتاز کر کے بتایا تو کیا ہر شخص یہ دعوی کرسکتا ہے کہ میں مومن اور ان تمام صفات کے ساتھ متصف ہونا تو درکنار اگر معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص ان صفات کی توصیف کرتا ہے تو وہ بیوقوف بلکہ پاگل خانہ میں بھیجنے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ زمانہ سابق میں نظر ڈالی جائے تو وہاں کے بھی معدودے چند ہی نظر آئیں گے۔ چنانچہ ابو عبداللہ علیہ السلام نے تمام شیعہ پر نظر ڈال کر فرمایا ''المؤمن اعز

من الکبریت الاحمر ''ہاں اگران صفات کے ساتھ متصف ہیں تو اولیاءاللہ ہیں فی الحقیقت ان کا پانا کبریت احمر کا پانا ہے۔غرضکہ امیرالمومنین کرم اللہ وجہہ چونکہ امام الاولیاء ہیں اولیائے کامل الایمان کے اوصاف بیان فرمادئے تاکہ لوگ ان صفات کو حاصل کرکے درجہءولایت تک ترقی کریں۔

کلینی ص۴۹۱ میں روایت ہے کہ ابوجعفر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مسلم وہ شخص ہے جس کی مبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہے۔

تسلیم: کلینی ص ۳۹۷ میں روایت ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام سے کسی نے پوچھا کہ مومن کس طرح پہچانا جاتا ہے کہ وہ ایمان دار ہے؟ فرمایا تسلیم سے کہ جو کچھ اس پر وارد ہوخواہ خوشی ہو یا مصیبت' سب پر وہ راضی ہو اور تسلیم کرلے۔

رضا: کلینی ص ۵۰۴ میں روایت ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مصیبتیں اللہ کی طرف سے عطیات ہیں۔

فقر: اوراسی کے صفحہ ۵۰۶ میں روایت ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ خدائے تعالیٰ نے موسی علیہ السلام سے فرمایا اے موسیٰ اگر تم دیکھو کہ فقر اور محتاجی متوجہ ہے تو کہو''مرحبا بشعار الصالحین ''اور جب دیکھو کہ غنا متوجہ ہے تو کہو کہ کوئی گناہ مجھ سے ایسا صادر ہوا ہے جس کی عقوبت دنیا ہی میں ہورہی ہے۔اوراسی کے صفحہ ۵۰۷ میں روایت ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ فقر مومنین کے لئے اعلی درجہ کی زینت ہے۔

تنگدستی: اوراسی کے صفحہ ۵۰۶ میں ہے کہ ابوعبدالہ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اگر یہ

شیعہ طلب رزق میں الحاح اور زاری نہ کرتے تو خدائے تعالیٰ ان کو حالت موجودہ سے بھی زیادہ تر تنگ حالت میں رکھتا۔

دنیا: اور اسی کے صفحہ ۵۲۹ میں روایت ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دینار و درہم نے پہلی امتوں کو ہلاک کیا اور وہ تم کو بھی ہلاک کرنے والے ہیں۔

زہد: اور اسی کے صفحہ ۵۰۹ میں ابوعبداللہ علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ملعون ہے وہ شخص جو دینار و درہم کی عبادت کرے، یعنی انہیں کے دھندے میں لگا رہے۔

اور اسی صفحہ کے ۴۳۰ میں روایت ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایمان کی حلاوت تمہارے دلوں میں داخل ہونا حرام ہے جب تک کہ تم دنیا میں زاہد نہ بنو۔

فقر: اور اسی کے صفحہ ۴۴۱ میں روایت ہے ابوعبداللہ علیہ السلام سے کہ دعا کی رسول اللہ ﷺ نے الٰہی رزق میرا اور میری آل کا اور جس نے مجھے یا میری آل کو دوست رکھا بقدر کفاف ہو یعنی ضرورت سے زیادہ رزق نہ ملے اور جو مجھے اور میری آل کو دشمن رکھے اسے مال اور اولاد دے انتہی۔

مطلب یہ کہ شیعہ کو سعادت دنیوی حاصل نہ ہو۔ یہ دعائے مستجاب ناطق ہے کہ اصلی شیعہ صوفیہ کرام ہی ہیں جن کے مذہب کی بنیاد فقر و فاقہ پر ہے۔ چنانچہ ان کے نام لیوا کچھ نہیں تو تبرکاً اپنے آپ کو فقیر کہتے ہیں اور گودڑی پہنتے ہیں، گو ہزار روپیہ قیمت کی کیوں نہ ہو،

غرضکہ ان کے عادات اور اصطلاحات اور روز مرہ کے حالات کا خیال اولیاء اللہ کی جماعت کی طرف منتقل کر دیتا ہے‘ ان حضرات کے بول چال سننے سے اور اس کے یہ معنی پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن حضرات کے واقعی حالات ایسے ہوں ان کی ولایت میں کوئی شک نہیں ۔ روایات مذکورہ کے سوائے زہد وقناعت وفقر کی ترغیب میں کلینی میں بکثرت روایتیں وارد ہیں‘ علی ہذا القیاس کتب حدیث اہل سنت میں بھی بھرے ہوئے ہیں جن کا انکار نہیں ہوسکتا۔ جن حضرات نے ان پر عمل کر کے خوشی سے فقر اختیار کیا سوائے زمرہ صوفیہ کرام کے‘ دوسرے لوگ بہت کم نظر آئیں گے۔

محاسبۂ نفس:

کلینی صفحہ (۵۸۵) میں ہے کہ ابوالحسن ماضی علیہ السلام فرماتے ہیں ہم لوگوں سے وہ شخص نہیں جو ہر روز نفس کا محاسبہ نہ کرے اور غرض سے کہ اچھا کام کیا ہے تو اللہ سے زیادتی طلب کرے اور برا کام کیا ہو تو مغفرت چاہے اور توبہ کرے۔ انتہی ۔ یہ طریقہ خاص اولیاء اللہ کا ہے کہ سوتے وقت دن بھر کے کاموں کا محاسبہ کرلیا کرتے ہیں۔

الحاصل ان تمام روایات سے ثابت ہے کہ ائمہء کرام کا مسلک وہی ہے جو اولیاء اللہ کا مسلک ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ائمہ کرام زمرۂ صوفیہ ہی میں محسوب ہیں اور شیعہ وہی حضرات ہیں جنہوں نے ائمہ کرام کے اقوال اور افعال کی پیروی کی اور درجہ ولایت تک پہنونچ گئے۔

یأس از خلق:

کلینی ص ۴۴۸ میں روایت ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص چاہے کہ خدائے تعالی سے جو کچھ مانگے اس کو عطا ہو تو اس کو چاہئے کہ کل آدمیوں سے مایوس ہو جائے اور سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی سے کچھ امید نہ رکھے جب خدائے تعالیٰ اس کے دل کی حالت پر مطلع ہوگا تو جو کچھ وہ مانگے گا عطا ہوگا۔ انتہی۔

یہ بات اولیاء اللہ کو حاصل ہے۔ پہلے تو وہ مانگتے ہی نہیں، اس لئے کہ جب خواہش سے فقر و فاقہ اور مصائب کو اختیار کیا تو کس چیز کے مانگنے کی ضرورت ہوگی۔ اور اگر مانگا بھی تو ایسی چیز جو دنیا سے متعلق نہیں، اس لئے کہ دنیا تو پہلے ہی سے ان کے حق میں مبغوص اور حیفہ ہو چکی۔ اب جو کچھ مانگیں گے وہ بات ہی دوسری ہوگی اور خدائے تعالی وہ ان کو عطا بھی کرتا ہوگا۔ اسی وجہ سے ان کے معاملات کچھ ایسے انوکھے ہوتے ہیں جو ہماری فہم و ادراک سے باہر ہیں۔

کلینی صفحہ ۵۵۱ میں روایت ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی مسلمان کو اپنی حکومت وغیرہ کے دباؤ سے ڈرائے کہ میں تجھے یہ مصیبت پہنچاؤں گا تو وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا، گو مصیبت نہ پہنچائے۔ اور اگر مصیبت بھی پہنچائے تو فرعون اور آل فرعون کے ساتھ دوزخ میں رہے گا۔

دیکھئے اس روایت میں کس قدر تہذیب اور آسائش خلق مدنظر ہے کہ حکومت کا دباؤ بھی کسی پر ڈالا جانا ناگوار اور باعث عذاب قرار دیا گیا۔ اب کیونکر خیال کیا جائے کہ ائمہ کرام کو اگر مدد ملتی تو کشت وخون کر کے سلطنت حاصل کرتے۔

حقوق مسلمان بر مسلمان:

کلینی صفحہ (۴۵۹) میں روایت ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ مسلمان کے مسلمان پر چند حقوق یہ ہیں کہ اس سے دلی محبت رکھے‘ اس کی غمخواری کرے‘ اگر مظلوم ہے تو اس کی مدد کرے اور مرج ائے تو اس کی قبر پر زیارت کے لئے جائے‘ اس کی تکذیب نہ کرے‘ اس کو اف نہ کہے اور اگر اس کو کہد ے کہ تو میرا دشمن ہے تو دونوں میں سے ایک کافر ہو جاتا ہے‘ اور اگر اس پر تہمت کرے تو ایمان اس کے دل میں ایسا گھل جاتا ہے جیسے نمک پانی میں۔ دیکھئے صرف دشمن کہد ینا باعث تکفیر فرمایا پھر اگر دشمنی رکھی جائے تو کس قدر ناجائز ہوگا۔ یہ تمام صفات اولیاء اللہ کے ہیں چنانچہ ان حضرات کا قول ہے۔ شعر۔

کفراست در طریقۂ ما کینۂ ما کینہ داشتن آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

جھگڑا نہ کرنا:

کلینی صفحہ (۴۸۱) میں روایت ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ اپنے دین کے معاملہ میں لوگوں سے جھگڑا نہ کرو کیونکہ مخاصمت دل کو بیمار بنا دیتی ہے۔ حق تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ﴿انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء﴾ و قال ﴿أأفانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین﴾ لوگوں کو اپنی حالت پر چھوڑ دو کیونکہ انہوں نے آدمیوں سے علوم حاصل کئے ہیں اور تم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور علی علیہ السلام سے حاصل کئے۔ میں نے اپنے والد سے سنا ہے کہ جب خدائے تعالیٰ اپنے بندہ کے لئے لکھ دیتا کہ ہمارے طریقہ میں داخل ہو تو وہ اس پرندے سے بھی

جلد تر آتا ہے جو اپنے گھونسلے کی طرف جاتا ہے انتہی۔

یہی مسلک اولیاء اللہ کا رہا ہے کہ نہ اعتقادات میں کسی سے بحث کرتے ہیں نہ اپنے طریقہ کی طرف کسی کو بلاتے ہیں مگر طالبین حق جوق در جوق ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے اور سینہ بسینہ جو علوم آنحضرت ﷺ سے ان تک پہنچے حاصل کرتے تھے اور اب تک وہی طریقہ جاری ہے۔

ترکِ دعوت:

کلینی صفحہ ۴۸۰ میں ہے کہ ابو عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ بندوں کے معاملہ کو خدائے تعالی پر چھوڑ دو وہ جس کو چاہے ظلمت سے نور کی طرف لیجائے انتہی ملخصا۔

یہ طریقہء ولایت کی طرف اشارہ ہے ورنہ اسلام کی دعوت اور امر بالمعروف اور نھی عن المنکر ضروریات دین سے ہیں، برخلاف اس کے طریقۂ ولایت کی تبلیغ بطور امر بالمعروف جائز نہیں کیونکہ ہر شخص میں یہ صلاحیت کہاں کہ غوامض شریعت کو سمجھے جس سے تقریب الی اللہ حاصل ہو جو اولیاء اللہ کے ساتھ مختص ہے۔

مدارج ایمان میں تفاوت اور ایمان کا معیار:

کلینی صفحہ ۳۸۶ میں روایت ہے عبدالعزیز سے کہ ابو عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ ایمان کے دس درجہ ہیں سیڑھی کی طرح کہ جو دوسرے درجہ پر ہے اس کو نہ چاہیئے کہ پہلے درجہ والے کو ساقط الاعتبار کر دے۔ اگر ایسا کرے تو اس سے اوپر والا اس کو ساقط کر دے گا بلکہ نیچے کے درجہ والے کو نہایت نرمی سے اوپر اٹھائے اور ایسا بار اس پر نہ ڈالے جس سے وہ

شکستہ ہو کیونکہ جس نے توڑا اس کو ضرور ہو گا کہ پھر اس کو درست کر دے۔ انتہی۔

کلینی صفحہ ۳۸۵ میں یہ روایت ہے کہ سراج جو ابو عبداللہ علیہ السلام کے خادم تھے وہ کہتے ہیں کہ میں نے آپ سے عرض کیا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو ہم کہتے ہیں وہ اس کے قائل نہیں، اس لئے ہم ان سے تبری کرتے ہیں۔ فرمایا کیا وہ تم سے محبت رکھتے ہیں اور جو تم کہتے ہو وہ اس کے قائل نہیں اس لئے تم ان سے بیزار ہو؟ کہا جی ہاں۔ فرمایا ہمارے نزدیک بھی ایسے علوم ہیں کہ تم ان کے قائل نہیں تو کیا ہم بھی تم سے تبری کریں؟ میں نے عرض کیا یہ کیونکر ہو سکتے؟ فرمایا تو تم کو چاہئے ان سے محبت رکھو کیونکہ مسلمانوں میں اسلام سے کسی کو ایک حصہ ہے کسی کو دو کسی کو تین کسی کو چار کسی کو پانچ کسی کو چھ کسی کو سات حصے ہیں، یہ مناسب نہیں کہ ایک حصہ والا مجبور کیا جائے ان امور پر جس پر دو حصہ والا عمل پیرا ہے۔ علی ہذا القیاس ہر کم درجہ والا اوپر کے درجہ والے کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا انتہی ملخصا۔ مطلب یہ کہ مدراج ایمان میں تفاوت ہوا کرتا ہے۔ شعر:

بر علوم غیب ہر کس چیز نیست طعمہء ہر مرغکے انجیر نیست

خیر خواہی اسلام اسے کہتے ہیں کہ پہلے درجہ والا مسلمان جو سب سے کم درجہ ہے سوائے عوام الناس کے اور کون ہو سکتا ہے، ان سے بھی محبت رکھنے کو فرمایا۔ اب ان سے عداوت رکھنے کے لئے کوئی تدبیر نہیں بجز اس کے کہ کافر بنائے جائیں اور یہ کہا جائے کہ عوام الناس کا کلمہ پڑھنا اور نماز، روزہ وغیرہ احکام اسلام ادا کرنا سب داخل نفاق ہے مگر اس کا ثبوت نہ قرآن و حدیث سے مل سکے گا نہ عقل سے کیونکہ منافق اس کو کہتے ہیں کہ

مسلمانوں کے خوف سے اعمال شرعیہ کو ظاہر کرے۔ اب اگر یہ سب منافق ہوں تو پوچھا جائے گا کہ ان کو کس کا خوف ہے جس نے ضروریات دین کو ظاہر کرنے پر مجبور کیا۔ عقل یہی گواہی دیتی ہے کہ ان کو اس موقعہ میں صرف خوف خدا ہے جس نے اعمال شرعیہ اور ایمان اور اعتقادات کے ظاہر کرنے پر مجبور کیا ہے، ورنہ وہ مثل کفار اپنے اعتقاد اور دوسرے دین کے اعمال ظاہر کرتے اور کھلم کھلا ان میں شریک ہو جاتے۔ غرض کہ ان کو منافق تو کسی طرح نہیں کہہ سکتے۔ اب یا نرے کافر کہئے یا مسلمان مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے آپ کو وہ مسلمان کہتے ہیں اور نبی ﷺ نے جو کچھ فرمایا اس کو مانتے ہیں، قرآن کو کلام الٰہی اور واجب العمل جانتے ہیں تو ہم ان کو کافر بھی نہیں کہہ سکتے، کیونکہ کفر اور ایمان کے سوا اور کوئی درجہ نہیں جس میں یہ داخل کئے جائیں۔

تکفیر میں احتیاط:

کلینی صفحہ (۵۴۷) میں ہے کہ ابو جعفر علیہ السلام نے فرمایا کہ جس نے کسی مسلمان کو کافر کہا تو اگر حقیقی کافر کو کافر کہا تو خیر، ورنہ کفر اس کہنے والے کی طرف رجوع کرتا ہے، اس لئے مسلمانوں پر طعن کرنے سے بچتے رہو انتہی۔

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافر کہنا خود کافر بننا ہے، بہر حال نہ ان کو منافق کہہ سکتے ہیں نہ کافر، تو یہی کہنا پڑے گا کہ وہ مسلمان ہیں۔ البتہ ایمان میں مدراج ہیں جیسا کہ روایات سابقہ سے معلوم ہوا اس وجہ سے اکثر مسلمان گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں، مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ گناہوں کی وجہ سے کافر ہو گئے، اگر ایسا ہو تو کوئی مسلمان نہ رہے کیونکہ

سوائے انبیاء کے کوئی معصوم نہیں۔

کلینی صفحہ ۵۸۹ میں ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر ایمان پورا ہو تو کوئی عمل ضرر نہیں دیتا انتہی۔

دیکھئے ائمہء کرام کی کس قدر شفقت اس امت مرحومہ پر ہے کہ غریب مسلمان جن کا سرمایہء ایمان بہت کم ہے ان کو بھی اسلام کے عالیشان دربار میں ایک درجہ عطا فرمایا اور شیعہء اہل بیت کو تقید کر دی کہ ان سے بھی محبت رکھا کریں۔ اور کافر بنانے والوں کو زجر کر دیا کہ خبردار کسی مسلمان کو کافر کہو گے تو تم کافر ہو جاؤ گے۔

بدگوئی اور تکفیر:

کلینی صفحہ (۴۰۲) میں مروی ہے کہ ابوجعفر علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارے شیعہ وہی ہیں جو لوگوں کی بدگوئی اور تکفیر سے زبان روکتے ہیں اور جب کسی کا ذکر کرتے ہیں تو بھلائی سے کرتے ہیں۔ انتہی۔

یہ صفت بھی خاص اولیاء اللہ کی ہے ورنہ عموماً دیکھا جاتا ہ کہ بے سبب لوگوں کی برائیاں نقل محفل ہوا کرتی ہیں۔

عداوت:

کلینی صفحہ (۵۲۲) میں ابوعبداللہ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ جب کبھی جبرئیل میرے پاس آئے یہی کہا کہ آپ لوگوں سے عداوت رکھنے سے بچتے رہئے۔ انتہی۔

اس روایت سے تعلیم امت مقصود ہے ورنہ حضرت کو عداوت سے کیا تعلق آپ تو سراپا رحمت ہیں۔ ابوعبداللہ علیہ السلام کا اس روایت کے بیان کرنے سے یہی مقصود تھا کہ شیعہ کسی سے عداوت نہ رکھیں۔ یہ صفت بھی اولیاء اللہ ہی میں پائی جاتی ہے جو خاص شیعہ ہیں' ورنہ ہم لوگ تو بات بات میں ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔

بغض: کلینی صفحہ (۵۴۲) میں ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ایک دوسرے سے بغض رکھنا مونڈ ڈالتا ہے' بالوں کو نہیں مونڈتا بلکہ دین کو مونڈ ڈالتا ہے انتہی۔

دیکھئے بغض کا کیسا برا اثر ہے کہ آدمی کو بے دین بنا دیتا ہے۔

سب وشتم:

کلینی صفحہ (۵۴۷) میں ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کو گالیاں دینے والا اس شخص کے مانند ہے جو ہلاکت کے قریب پہنچ گیا ہو انتہی۔

افسوس ہے یہ حالت محسوس نہیں ہوتی اس لئے لوگ نہ زندوں کو چھوڑتے ہیں نہ مردوں کو' البتہ اولیاء اللہ کو اس کا مشاہدہ ہوتا ہوگا اس لئے کبھی وہ ایسے ناشائستہ حرکات کے مرتکب نہیں ہوتے۔

مذمت وعیب جوئی:

کلینی میں روایت ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

کہ مسلمانوں کی مذمت نہ کرو اور نہ ان کے عیوب کی تلاش کرو، ورنہ خدائے تعالیٰ تمہیں رسوا کرے گا۔ انتہی ملخصا۔

یہ بھی اولیاء اللہ ہی کا خاصہ ہے ورنہ عام مسلمان تو اکابر دین کے عیوب تلاش کرتے ہیں بلکہ فضائل کو عیوب کی شکل سے ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ حریز بن عثمان محدث کا قول تہذیب التہذیب میں ہے وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت یہ فرمایا ہے ''انت منی بمنزلة هارون من موسی'' وہ حدیث تو صحیح ہے مگر سننے میں غلطی ہوئی، دراصل حضرت نے ''بمنزلة قارون'' فرمایا تھا ''نعوذ بالله من ذلک''

اسی طرح بہت سی روایتیں اکابر دین کی نسبت تراشی گئیں، خلفائے راشدین نے اسلام میں جو جو ترقیاں کیں اور تدین اور راست بازی سے کام لئے، اظہر من الشمس ہے یہاں تک کہ غیر ملت والے ان کی داد دیتے ہیں، مگر حضرات شیعہ اور خوارج نے ان سالہا سال کی کارگذاریوں میں تلاش کر کر کے دس بیس عیب ہر ایک کے نکال ہی لئے حالانکہ انصاف کی نظر سے دیکھیں تو وہ بھی عیب نہیں ہو سکتے۔ مگر چشم بد اندیش کا کیا علاج!!

تذلیل مومن:

کلینی صفحہ (۵۴۵) میں ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے کہا کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص میرے ایمان دار بندہ کو ذلیل کرنا چاہتا ہے وہ میرے مقابلہ کیلئے میدان میں کھڑا ہو گیا۔ انتہی۔

دیکھئے اس حدیث قدسی میں ایمانداروں کی تذلیل و توہین کی کیسی سخت وعید ہے

جب عموماً ایمانداروں کا یہ حال ہو تو کبار صحابہ کی توہین و تذلیل میں کس قدر عتاب الٰہی کا اندیشہ ہے۔ اب رہی یہ بات کہ شیعہ غالیہ ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنھم کو اور خوارج عثمان و علی رضی اللہ عنھما کو نعوذ باللہ بے ایمان قرار دے کر توہین اور ذلیل کرتے ہیں سو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کافر قرار دینے سے توہین کی اجازت ہو جائے' اس لئے کہ ان حضرات کا بے ایمان ہونا قطعی طور پر تو ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا۔ ان لوگوں کو چاہئے کہ اس لاکھوں مسلمانوں کی جماعت پر نظر ڈالیں جو نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت سے قائم ہے' جن میں تمام صحابہ شامل تھے اور ان دونوں فریقوں کا اس وقت وجود بھی نہ تھا کیونکہ یہ دونوں فرقوں کی ابتداء حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ خلافت سے ہوئی۔ ابوعبداللہ علیہ السلام کے ارشاد سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں فرقے مشرک ہیں کیونکہ کلینی صفحہ (۵۶۲) میں ہے کہ ابوالعباس کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ علیہ السلام سے پوچھا کہ آدمی مشرک کب ہو جاتا ہے فرمایا کہ ادنی یہ ہے کہ کوئی رائے ایسی نکالے جس سے کسی کا محبوب اور کسی کا مبغوض بنے انتہی۔

دیکھئے یہ دونوں نئی رائیں تھیں یا نہ تھیں تاریخوں سے اس کی تصدیق کر لی جائے غرضکہ ان نئے فرقوں سے پہلے کے مسلمانوں پر نظر ڈالی جائے تو مبرہن ہو جائے گا کہ دونوں فرقوں کے معتمد علیہ یعنی چاروں صحابہ کے کامل الایمان اور کابردین ہونے پر لاکھوں اہل اسلام گواہی دے رہے ہیں۔ جس سے ثابت ہے کہ ہر فرقہ کے بانیوں نے خودغرضی سے اکابردین کو معاذ اللہ بے ایمان قرار دیا۔ اب اگر لاکھوں کی گواہی کالعدم کر دی جائے

اورقرائن قاطعہ مثل اشاعت اسلام وغیرہ بیکار کر دیئے جائیں تو دنیا میں تو کوئی نہیں پوچھ سکتا، مگر قیامت کے روز حکم الحاکمین کے مقابلہ میں کھڑا ہونا پڑیگا۔ معلوم نہیں اس روز کیا گذرے گی۔ بہر حال عقل واحتیاط کا مقتضیٰ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بزرگان دین کی توہین سے بہت احتراز کرنا چاہئے۔

کلینی صفحہ (۵۳۳) میں روایت ہے کہ سماعہ کہتے ہیں کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا کہ تم فحش گوئی اور لعنت کرنے سے بچتے رہو' یہ نہ میرا کام ہے نہ میں نے اپنے شیعہ کو اس کا حکم کیا انتہی۔

مسئلہ لعنت بر یزید؟:

اس سے معلوم ہوا کہ جن شیعہ کو آپ نے لعنت کرنے سے منع فرمایا انہوں نے اس کی تعمیل کی، وہ شیعہ ہی دوسرے ہیں یعنی اولیاء اللہ جو کسی پر لعنت نہیں کرتے اگرہ کہ اہل سنت لعنت کرنے سے نہایت بچتے ہیں' یہاں تک کہ یزید پر بھی لعنت نہیں کرتے مگر اولیاء اللہ اس سے بھی زیادہ محتاط ہیں چنانچہ وہ شیطان پر بھی لعنت کرنے کو فضول سمجھتے ہیں۔

کلینی میں ابوعبداللہ علیہ السلام سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ غیبت مسلمان کے دین کو اس سے زیادہ جلد تباہ کرتی ہے جو پھوڑا کسی کے پیٹ میں ہو جائے۔ اور اسی میں ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص جو کچھ کسی مسلمان سے دیکھے یا سنے وہ کہدے تو وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کی نسبت حق تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشة فی الذین امنوا لھم عذاب الیم﴾ یعنی جو

لوگ دوست رکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں بے حیائی شائع ہو‘ان کو درد دین والا عذاب ہے انتہی ۔ دیکھئے باوجودیکہ اپنی آنکھ سے دیکھنے اور اپنے کان سے سننے کے بعد آدمی کو یقین کامل ہو جاتا ہے مگر اس یقین کے بعد بھی لوگوں کی برائیاں بیان کرنا جائز نہیں اور ارشاد ہے کہ ایسے لوگ سخت عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ تو اب کہئے کہ صحابہ کی برائیاں تیرہ سو سال کے بعد بیان کرنا کس قدر خطرناک ہوگا۔ خوارج کے پیشواؤں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ وغیرہ صحابہ کے فضائل کو نظر انداز کر کے ان کی برائیوں کو شائع کیا۔ جب دیکھی ہوئی بات بیان کرنے میں عذاب الیم کی وعدی ہو تو ان دیکھی بات پر خدا جانے کیا ہوگا!

یہاں سے اہل انصاف سمجھ سکتے ہیں کہ اہل سنت نے جو طریقہ اختیار کیا وہ کیسا اسلم اور قابل اطمینان ہے‘ ان کو اس باب میں کسی قسم کا حوف ہی نہیں اور اگر کسی موقع میں کوئی بے اعتدالی ان سے ہو بھی گئی تو ان حضرات کو دعا دے کر یعنی ’’رضی اللہ عنھم‘‘ کہہ کر اس کا کفارہ کر لیتے ہیں‘ کیونکہ کلینی صفحہ (۵۴۶) میں ہے کہ ابو عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ نبی ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ غیبت کا کفارہ کیا ہے؟ فرمایا جس کی غیبت ہو اس کی مغفرت کے لئے دعا کرے۔ یہ چند روایتیں جو لکھی گئیں ان سے ظاہر ہے کہ ائمہ کرام کی طرز معاشرت اعمال و احوال میں کس قسم کی تھی‘ اہل سنت و جماعت میں جو اولیاء اللہ ہیں ان حضرات کے طریقہ کو پورا اختیار کیا اور اس پر عامل و کاربند رہے اور یہ ان حضرات کا فیضان معنوی تھا۔

کلینی صفحہ (۲۴۷) میں ہے کہ ابو عبداللہ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ’’خلق ارواح

شیعتنا من طینتنا ''یعنی ہمارے شیعہ کی ارواح ہماری طینت سے پیدا ہوئیں اسی مناسبت کی وجہ سے وہ اعمال شاقہ اولیاء اللہ پر آسان ہو گئے۔ الحاصل اہل بیت کرام کی امامت معنوی تھی جس کی نسبت حضرت امام موسیٰ کاظمؓ نے فرمایا کہ ہم ائمہ قلوب ہیں اور بیعت بھی ان حضرات کی تو صرف وہی بیعت ہے جو مشائخین میں اب تک مروج ہے اور اولیاء اللہ کے ذریعہ سے جاری رہی۔ اس طریقہ کے صدر حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں کیونکہ آنحضرت ﷺ نے آپ کو امام الاولیاء فرمایا ہے' اس وجہ سے تقریباً کل طریقے اور سلاسل الٰہی آپ ہی کی ذات مفیض البرکات کی طرف منسوب اور مستند ہیں۔ مگر ابن سبا نے جو تخم بویا تھا اور اس کی کمیٹیاں قائم ہوگئی تھیں انہوں نے لفظ امامت سے اپنا مطلب نکالا اور اس مسئلہ پر ایسا زور دیا کہ مسلمانوں میں بیحد فساد اور تلاطم عظیم برپا ہوا کہ جس کی اصلاح ممکن نہیں معلوم ہوتی۔

ہر چند ظاہراً اس مسئلہ سے اہل بیت کرام کی تعظیم و تکریم تو نہایت درجہ کی ہوئی مگر ابن سبا کا مقصود اس سے کچھ اور ہی تھا' اس نے دیکھا کہ یہی ایک ایسا مسئلہ ہے کہ عام خونریزیوں کا سر چشمہ بن سکتا ہے' اس لئے جب عموماً سادات امامت کے مستحق ہوں اور بادشاہ وقت غاصب امامت سمجھا جائے تو سوائے چند نفوس قدسیہ کے ایسے کون ہوں گے جن کو حکومت کا خیال نہ ہو' اکثر سادات اپنے چند معتقدوں اور مریدوں کی تائید سے اپنا حق لینے کو خروج کریں گے۔ اور اہل نفوس قدسیہ اگر طالب نہ بھی ہوں تو ان کے سہارے میں دوسرے لوگ اپنا مطلب نکالیں گے۔ پھر سیادت کوئی محسوس چیز تو ہے ہی نہیں' بعضے خبیث

النفس ایسے بھی ہوں گے کہ اپنے آپ کو سید مشہور کر کے دعوائے امامت کریں گے' پھر جب مدعیان امامت کی کثرت ہوگی تو ان میں باہمی مخالفتیں ضرور پیدا ہوں گی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سلاطین سادات کرام کے دشمن ہو کر ان کے آزار اور قتل کے درپے ہوں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ منصور نے حضرت امام حسن و امام حسین رضی اللہ عنہما کی تمام اولاد کو محبس میں قید کر دیا جیسا کہ تاریخ کامل سے ظاہر ہے اور تعجب نہیں کہ ان حضرات کے قتل کا بھی ارادہ کیا ہوتا کہ صفحہ ء زمین پر اہلبیت کا نام ونشان ہی باقی نہ رہے۔ غرضکہ ابن سبا نے اس تدبیر میں دو منفعتیں سوچیں' ایک یہ کہ سادات کرام سلاطین اسلام کے ہاتھ سے قتل کئے جائیں اور کم سے کم اتنا ضرور ہو کہ ان کے ہاتھ سے سخت مصیبتوں اور ذلت و خواری میں مبتلاء رہیں، اور دوسری یہ کہ مسلمانوں میں خونریزی کا سلسلہ جاری رہے جس سے یہودیوں کے آنکھوں کی ٹھنڈک ہو اور ایسا ہی ہوا کہ ان مخالفتوں سے لاکھوں مسلمانوں کی خونریزی ہوئی۔

واقعہ ء مختار:

چنانچہ کتب تواریخ سے ظاہر ہے اس مسئلہ کی بدولت جن لوگوں نے موقعہ پا کر خونریزی کی' اس کے نظائر بہت سے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک مختار کا واقعہ ہے جس کو تاریخ کامل میں لکھا ہے کہ مختار بن عبید جو پہلے خارجی تھا اس کو ابتداء سے حکومت کا شوق تھا اس غرض سے اس نے زبیرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی مگر وہ غرض پوری نہ ہوئی' پھر جب حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے واقعہ ء جانکاہ نے مسلمانوں کے دلوں کو غمگین اور بیخود کر

دیا' اور دیکھا کہ شیعہء اہل بیت کے دلوں میں جوش وخروش ہے تو شیعی ہو گیا۔ چنانچہ کوفہ وغیرہ میں شیعہء کے مجمعوں میں جا کر اس واقعہ پر نہایت درجہ غم کا اظہار اور گریہ وزاری کرتا جس سے ان کا میلان اس کی طرف ہوا' پھر ظاہر کیا کہ محمد بن حنفیہؓ جو امام وقت ہیں انہو ں نے اہلبیت کے خون کا بدلہ لینے کے لے مجھے مامور فرمایا ہے۔ چنانچہ شیعہ کو فراہم کر کے خوب خونریزی کی' اس ضمن میں یہ کام کیا کہ جتنے اہلبیت کے قتل میں شریک تھے ان کو چن چن کر قتل سزا دی' جس سے محبین اہلبیت کے دلوں کو تشفی ہوئی' مگر اور بے گناہ لوگ بھی بہت سے مارے گئے۔ اس جنگ سے اس کو سوائے حکومت حاصل کرنے کے اور کوئی مقصود نہ تھا' اس لئے کہ شیعیت تو در کنار اس کے اسلام میں بھی کلام ہے۔ چنانچہ اس سے ظاہر ہے کہ کبھی کہتا کہ مجھ کو وحی ہوئی ہے کہ فلاں کام ایسا ہوگا' اور کبھی کہتا کہ امام وقت یعنی محمد بن حنفیہ کے ذریعہ سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ فلاں کام ایسا ہوگا۔ پھر اگر اس کے خلاف میں کوئی بات ظاہر ہوتی اور لوگ اس سے پچھ کہتے تو جواب دیتا کہ بات وہی تھی مگر خدا کو یہ بات اب سوجھی ہے۔ اس قسم کے خرافات جب محمد بن حنفیہؓ کو معلوم ہوئے تو آپ نے اس سے تبری کی۔ اس کے سوا اور بہت سے امور اس سے متعلق ''ملل ونحل'' اور ''تاریخ کامل'' میں لکھے ہیں۔

فتنہ قرامطہ:

''تاریخ دول اسلامیہ'' میں لکھا ہے کہ ایک شخص خوزستان سے سواد کوفہ میں آ کر ریاضت میں مشغول ہوا' یہاں تک کہ جب کثرت صوم وصلواۃ اور عبادات سے اقران و

معاصرین پر اس کی فوقیت مسلم ہوگئی اور معتقدین کے دلوں پر پورا تسلط کرلیا تو امتحان کے لئے چند معمولی مسائل نماز و روزہ کے ایسے بیان کئے جو مخالف اجماع و احادیث تھے' معتقدین نے انہیں پر عمل شروع کر دیا' اس امتحان کے بعد بطور راز کہا کہ دیکھو حدیث ''**من لم یعرف امام زمانه**'' کی رو سے امام زماں کو معلوم کرنا نہایت ضروری امر ہے۔ مگر یہ یاد رکھو کہ امام زماں کا خاندان نبوت اور اہلبیت سے ہونا ضروری ہے اور وہ قریب میں نکلنے والے ہیں۔ چنانچہ وہ سب ان کے مشتاق ہوگئے اور آپ شام کو چلا گیا' وہاں بھی اسی تدبیر سے لوگوں کو امام زماں کا مشتاق اور منتظر بنا دیا' جب ایک وسیع ملک امام زماں کا مشتقاو منتظر ہوگیا تو اس کے قرابتداروں سے ایک شخص جس کا نام ذکرویہ تھا اپنے تئیں محمد بن عبداللہ بن اسماعیل بن امام جعفر صادق مشہور کر کے امامت کا دعویٰ کیا' لوگ تو منتظر ہی تھے فوراً ایک لشکر عظیم فراہم ہوگیا اور مہدی صاحب نے اپنے معتقدوں کو لوٹ کھسوٹ پر لگا دیا اور شدہ شدہ یہاں تک نوبت پہونچی کہ مکہ معظّمہ پر مسلط ہوکر اس قدر مسلمانوں کو قتل کیا کہ کسی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ وہی فتنۂ قرامطہ ہے جس سے تواریخ کے جزو جزو سیاہ ہیں۔ انتہی ملخصا۔

دیکھئے ذکرویہ کس آسانی سے اہلبیت میں داخل ہوکر امام زماں بن گیا اور ابن سبا کے مقصود کو پورا کیا۔

اگر سیادت کوئی محسوس چیز ہوتی تو لوگ پہچان جاتے کہ وہ امام نہیں ہوسکتا مگر ابن سبا کا تو مقصود یہی تھا کہ خونریزی کا دروازہ مسلمانوں میں کھلا رہے۔ اگر وہ اس زمانہ میں

ہوتا تو اس واقعہ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور آتش عناد جو مسلمانوں کے اتفاق اور ترقی کو دیکھ کر یہودیت کی وجہ سے اس کے دل میں بھڑک رہی تھی کسی قدر سرد ہوتی۔

بہر حال مقصود تو اس کا پورا ہوا' وہ نہیں تو اس کی ملت والے یہود جو مسلمانوں کے خون کے بہاسے تھے ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔

کتب تواریخ میں بہت سے واقعے موجود ہیں کہ حکومت کے خواہشمندوں نے ابن سبا کے شرائط امامت کو ملحوظ رکھ کر دعوائے امامت کیا اور دل کھول کر مسلمانوں کو قتل کیا اور کرایا۔ مسئلہ امامت کی بدولت جو مسلمان قتل ہوتے گئے اگر حساب کیا جائے تو لاکھوں سے نوبت متجاوز ہو جائے گی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے یہودی قتل ہوئے تھے مگر وہ معدودے چند تھے' ان کے معاوضہ میں ابن سبا نے مسلمانوں کو جو قتل کرایا ہزاروں حصے اول سے زائد ثابت ہوں گے۔ اور باوجود تیرہ سو سال گذرنے کے مخالفت باہمی کا سلسلہ ہنوز جاری ہے' اور توقع نہیں کہ اس کا خاتمہ ہو کر مسلمانوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا ہو۔ حالانکہ طرفین کو اقرار ہے کہ ابن سبا ایک یہودی شخص تھا اور منافقانہ مسلمان ہو کر علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت ایسے ایسے عقائد اس نے تراشے کہ خود آپ نے اس کو جلا دینے کا حکم فرمایا' اگر سفارش نہ ہوتی تو جلا دیا جاتا' سفارش کی وجہ سے جلاوطن کیا گیا۔ اور اسی کے شائع کئے ہوئے عقائد کے لحاظ سے آپ نے فرمایا: ''یھلک فیّ رجلان: محب مبطر یضعنی غیر موضعی و یمد حنی بما لیس فیّ '' جیسا کہ ناسخ التواریخ سے ابھی لکھا گیا' جس کا ماحصل یہ ہے کہ میری دوستی کا دعویٰ کرنے والے اس درجہ میں مجھے قائم

کریں گے جو میرا درجہ نہیں اور ایسی تعریفیں کریں گے جو مجھ میں نہیں ہیں' ایسے لوگ ہلاک ہوں گے۔ کہئے وہ درجہ کیا ہے؟ یہی ہے کہ خدا بنایا! نبوت میں شریک کیا! خلیفہ بلا فصل بنایا' حالانکہ ابوبکر وعمرؓ کے ہاتھ پر بخوشی بیعت کرنے کا آپ نے اقرار کیا اور یہ بھی فرما دیا کہ امامت کیلئے نہ سیادت شرط ہے نہ وصی ہونا نہ عصمت نہ زہد نہ تقوی جیسا کہ ابھی معلوم ہوا۔ اس کے سواء اور بہت سے اقوال حضرت کے شیعہ وسنی نقل کرتے ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے خلافت بلافصل کا کبھی دعوی نہیں کیا' نہ اس کا کہ وصی ہونے کی وجہ سے میری خلافت ثابت ہوگئی۔

وصی کا کام قضائے دیون اور انجاز وعد ہے:

دیکھئے ناسخ التواریخ (صفحہ ۶۹) کی جلد دوم میں اور کلینی صفحہ (۱۴۴) میں یہ حدیث لکھی ہے ''عن انس قال قلنا لسلمان سل النبی ﷺ من وصیه؟ فقال له سلمان یا رسول الله من وصیک؟ فقال یا سلمان من کان وصی موسی؟ قال یوشع بن نون فقال فان وصیی و وارثی یقضی دینی وینجز موعدی علی بن ابی طالب'' ترجمہ: یعنی انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے سلمان فارسیؓ سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ سے آپ پوچھئے کہ آپ کے وصی کون ہیں؟ انہوں نے پوچھا' حضرت نے فرمایا: اے سلمان۔ موسی کے وصی کون تھے؟ کہا یوشع بن نون' فرمایا: میرے وصی اور وارث علی بن ابی طالب ہیں جو میرا قرض ادا کریں گے اور وعدے پورے کریں گے انتھی۔

اس سے ظاہر ہے کہ آپ وصی صرف اس کام کے لئے مقرر فرمائے گئے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے دیون وغیرہ ادا کریں، خلافت سے کوئی تعلق نہیں، ورنہ ان کاموں کی تخصیص نہ فرماتے۔ اگر وصی کو خلافت لازم ہوتی تو کل صحابہ آپ ہی کے ہاتھ پر بیعت کرتے حالانکہ ناسخ التواریخ سے آپ کی یہ آرزو اور تمنا ثابت ہوتی ہے کہ کاش چالیس ہی آدمی بیعت ہی کر لیتے تو ان کی کمک اور مدد سے خلافت چھین لیتے۔ ان تمام قرائن و تصریحات سے ظاہر ہے کہ جتنی روایتیں اس قسم کی ہیں سب ابن سبا اور اس کی کمیٹی والوں کی تراشی ہوئی ہیں۔ دراصل آپ نے بطیّب خاطر بیعت کی تھی۔

خلیفہ مقرر کرنا اور شوری مہاجرین وانصار کا کام تھا:

اسلئے صحابہ میں یہ بات مسلم تھی کہ خلیفہ کا مقرر کرنا مہاجرین وانصار کا کام ہے، اس کا ثبوت کافی خود علی کرم اللہ وجہہ کے اس ارشاد سے ہوتا ہے جو نہج البلاغۃ اور ناسخ التواریخ کی جلد سوم صفحہ ۱۱۶ میں ہے کہ امیر المومنین علیؓ نے معاویہؓ کے نام ایک نامہ لکھا جس میں یہ عبارت بھی موجود ہے۔: ”**وانه بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر و عمر و عثمان علی ما بایعوهم علیه فلم یکن للشاهد ان یختار و لا للغائب ان یرد و انما الشوری للمهاجرین والانصار، فان اجتمعوا علی رجل فسموه اماما کان ذلک لله رضی**“۔ یعنی میرے ہاتھ پر ان لوگوں نے بیعت کی ہے جنہوں نے ابوبکر، عمر وعثمان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اس کے بعد نہ کسی موجود شخص کو حق ہے کہ دوسرے کو اختیار کرے اور نہ غائب کو حق ہے کہ اسکو رد کرے، کیونکہ شوری کا حق مہاجرین و

انصار کو ہے، اگر وہ کسی شخص پر اتفاق کر کے اس کو اپنا امام مقرر کرلیں تو اسی کی امامت پر خدا بھی راضی ہے انتہی۔

دیکھئے جب خود علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ خلیفہ مقرر کرنے کا حق مہاجرین و انصار کو تھا تو آپ ہی کی تصریح سے ثابت ہو گیا کہ خلیفہ کے لئے وصی ہونا شرط نہیں۔اب ہم ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ یہ دو خبریں جو آپ نے دی ہیں کہ ''شوری کا حق مہاجرین وانصار کو تھا اور انہوں نے جس کو امام مقرر کرلیا خدا کی بھی اس میں رضامندی ہے'' جھوٹی خبریں ہیں۔ **نعوذ باللہ من ذالک** ۔اب کہئے کہ جن خلفاء کی نسبت خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمارہے ہیں کہ خدائے تعالیٰ ان سے راضی ہے تو کیا ممکن ہے کہ آپ ان سے ناراض ہوں گے۔

صدیقؓ وفاروقؓ کے عدل وحسن سیرت کی مدح:

ناسخ التواریخ صفحہ (۲۴۱) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک اور نامہ نقل کیا ہے جس میں یہ عبارت ہے۔: **''ثم قبضه الله يعنى النبى ﷺ و قد ادى ما عليه ثم استخلف الناس ابابكر، ثم استخلف ابوبكر عمر و احسنا السيرة وعدلا فى الامة ثم ولى عمر الناس عثمان، فقتلوه ثم اتانى الناس و انا معتزل امرهم، فقالو الى: بابع فابيت عليهم فقالو الى: بابع فان الامة لاترضى الابك و انا نخاف ان لم تفعل ان يفترق الناس فبايعتهم** '' دیکھئے اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کو خلیفہ مقرر کرنے کا حق تھا کیونکہ آپ اس

خدمت سے علیحدہ رہنا چاہتے تھے، مگر جب دیکھا کہ لوگ آپ ہی کی خلافت سے راضی ہیں تو قبول فرمایا، اگر یہ بات نہ ہوتی تو صاف فرما دیتے کہ تمہیں خلیفہ بنانے کا حق ہی کیا ہے، خلیفہ بننے یا نہ بننے میں میں مختار ہوں بلکہ یہ فرما دیتے کہ میں وصی رسول اللہ ﷺ ہوں، اس وجہ سے خود پہلے ہی سے میں خلیفہ ہوں۔ مگر اس قسم کی کوئی بات نہیں فرمائی بلکہ وہ صاف فرماتے ہیں کہ لوگوں کے اصرار پر میں نے بیعت خلافت لی۔ یہی بات ابوبکرؓ کی خلافت میں تھی جیسا کہ خود فرماتے ہیں: ''**استخلف الناس ابابکر** ''یعنی لوگوں نے ابوبکرؓ کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔ اس کے سوائے متعدد خطوط اور خطبوں میں یہ مضمون موجود ہے' جو ناسخ التواریخ اور نہج البلاغہ میں منقول ہیں۔ غرضکہ کل صحابہ کے اجماع سے یہ بات ثابت ہو چکی کہ وصیت و خلافت میں کوئی تلازم نہیں' اور یہی بات علی کرم اللہ وجہ تصریحات اور عمل سے ثابت ہے۔

تشیع کی اصل یہود سے ماخوذ ہے:

اس سے ظاہر ہے کہ یہ جوڑ ابن سبا کی لگائی ہوئی ہے' کیونکہ اس کا یہودی ہونا شیعہ اور سنی کے اتفاق سے ثابت ہے اور یہ مسئلہ یہود کے یہاں کا ہے، جیسا کہ ''بحار الانوار'' جو حضرات شیعہ کے یہاں معتبر کتاب ہے اس میں لکھا ہے: ''**و ذکر بعض اھل العلم ان عبداللہ بن سبا کان یھودیا فاسلم و والی علیا علیہ السلام و کان یقول و ھو علی یھودیتہ فی یوشع بن نون انہ وصی موسی بالغلو فقال فی اسلامہ بعد وفاۃ رسول اللہ ﷺ فی علی مثل ذلک و کان اول من شھر**

بالقول لفرض امامة علی و اظھر البراء ة من اعدانه و کاشف مخالفته و اکفر ھم فمن ھھنا قال من خالف الشیعة ان اصل التشیع و الرفض ماخوذ من الیھود''۔

دیکھئے اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح ابن سبا یہودیت کے زمانہ میں یوشع بن نون کوموسی علیہ السلام کا وصی کہتا تھا' اسی بناء پر علیؓ کے وصی اور مستحق امامت ہونے پر اس نے زور دیا۔اس سے ثابت ہے کہ یہ مسئلہ اس یہودی نے مسلمانوں میں فساد کی غرض سے شائع کیا، اول اس کو کوئی جانتا ہی نہ تھا۔اور''تاریخ کامل'' میں جولکھا ہے کہ ابن سبا نے اس مسئلہ کی ابتداء کی، وہی بات ''بحارالانوار'' سے بھی ثابت ہوگئی۔ ہر چند تخمیناً چوبیس (۲۴) سال تک اس مسئلہ کا ذکر ہی نہ تھا مگر جب ایک جماعت میں اس کی گفتگو ہونے لگی جوابن سبا کی کمیٹی کے لوگ تھے جن کو مسلمان اپنے ہم مشرب سمجھتے تھے اور وہ مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی غرض سے بالاتفاق قائل ہوگئے تو بعض ناواقف مسلمان بھی اس کی حقیقت کے قائل ہونے لگے، اور قاعدے کی بات ہے کہ جب ایک جماعت کسی چیز کو مہتم بالشان بنائے اور ہمیشہ اس میں گفتگو ہوا کرے تو وہ جماعت وقتاً فوقتاً ترقی کرتی جاتی ہے غرضکہ شدہ شدہ ایک بڑی جماعت بن گئی۔

مسئلہءبداء:

یہود مسئلہ بداء کے بھی قائل تھے چنانچہ ابن حزمؒ نے ملل ونحل میں یہود کے حالات میں لکھا ہے کہ یہود کی توریب موجود میں ہے کہ حق تعالی نے موسی علیہ السلام سے کہا کہ

قریب میں اس امت کو ہلاک کر کے ایک بڑی امت کا پیشوا بناتا ہوں مگر موسی علیہ السلام چاہتے تھے کہ ایسا نہ ہو، حق تعالی نے انہی کی مرضی کے مطابق کیا۔ یعنی اپنے ارادہ سے باز آیا انتہی۔

سلیمانیہ جو شیعہ میں ایک فرقہ ہے اس کے بانی سلیمان بن جریر کا قول ابھی لکھا گیا کہ رافضیوں کے اماموں نے بداء کا مسئلہ عجیب نکالا ہے کہ جب وہ پیشگوئی کرتے ہیں کہ ہمارا غلبہ ہوگا اور چنیں و چناں ہوگا اور وہ ایسا نہ ہوا تو کہہ دیتے ہیں کہ پہلے وہی بات علم الٰہی میں تھی جو ہم نے کہی تھی مگر اس کے بعد خدا کو یہ بات سوجھ گئی جس کا وقوع ہوا۔ ہر چند اس قول سے انہوں نے ذاتی نفع اٹھایا' مگر ابن سبا نے اپنے دین کے مسئلہ کو مسلمانوں میں جو پھیلایا ہوگا اس سے اس کا مقصود ہی کچھ اور ہوگا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اس نے دیکھا کہ علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت اہل حل وعقد کے اتفاق سے ثابت ہوگئی تو قیامت تک مسلمانوں میں وہ مسلم رہے گی۔ ہر چند اس کی تمہید یعنی فتنۂ قتل عثمانؓ میں کامیابی ہوئی کہ ہزارہا مسلمان مارے گئے، مگر شامیوں کا جوش چند روز میں خود سرد ہو جائیگا، کیونکہ یہ عثمانؓ کے خون کے بدلے سے متعلق ہے، اس کو نفس خلافت سے کوئی تعلق نہیں، خلافت سے متعلق کوئی ایسی بات نکالنی چاہئے کہ جب تک خلافت مسلم رہے اختلاف وخلاف باہمی بھی جاری رہے۔ چنانچہ اس کے لئے یہ تلقین شروع کر دی کہ خلفاء ثلاثہ کے زمانہ میں منظور الٰہی تھا کہ انہیں حضرات کے ہات پر بیعت ہو جس کا ظہور بھی ہوا کہ سب مسلمانوں نے یہاں تک کہ خود امیر المومنین علیؓ نے بھی بیعت کر لی مگر عثمانؓ کے قتل کے بعد خدائے

تعالیٰ کو یہ بات سوجھی کہ زمانہ گزشتہ میں بھی علیؓ خلیفہ ہوں اور وہ خلافت گزشتہ بی آپ ہی کو مسلم ہوگئی معتقدوں نے اس کو مان لیا۔ اور کیونکر نہ مانتے باوجود یہ کہ جانتے تھے کہ علی کرم اللہ وجہہ ابوطالب کے فرزند ہیں، اس پر بھی اس کی جادو بیانی سے آپ کو خدائے عزوجل تسلیم کرلیا یعنی آپ کی الوہیت کے قائل ہوگئے، تو چند گزشتہ سالوں کی خلافت کا تسلیم کر لینا کونسی بڑی بات تھی۔ دیکھئے اسی کا اثر ہے کہ تیرہ سو سال سے تقریباً اہل اسلام مانتے ہیں کہ جس زمانہ میں حکام کا عزل ونصب اور صلح وجنگ خودمختاری سے آپ کرتے تھے، آپ خلیفہ برحق تھے، مگر حضرات شیعہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی آپ خلیفہء برحق تھے۔ جب کہ خلفائے ثلاثہ کے ہاتھ پر بیعت کرکے ان کی اطاعت کرتے تھے۔ اگر یہی اصطلاح ٹھہرائی جائے کہ محکوم بھی حاکم ہوتا ہے جیسے بعض اساتذہ اپنے شاگردوں کو استاد سمجھتے ہیں تو میری رائے میں اس کا کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ ''لا مشاحة فی الاصطلاح'' مگر مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی خلافت پر بھی قناعت نہیں بلکہ اس طرح ترقی کی جاتی ہے کہ کل صحابہ اس خلافت کو نہ ماننے والے کافر ہوگئے تھے اور صرف چار پانچ حضرات مومن تھے۔ اب جو حضرات کافر سمجھے جاتے ہیں ان کا حال دیکھا جائے تو ظاہر ہے کہ جس طرح نبی ﷺ کے زمانہ میں اپنے آبائی طریقہ کو چھوڑ کر خدائے تعالیٰ کی الوہیت اور نبی ﷺ کی رسالت کو مانتے تھے اور نماز وروزہ حج وزکوۃ وغیرہ اسلامی کاموں میں بہ دل وجان ساعی تھے، اسی حالت پر رہے اور بت پرستی وغیرہ لوازم کفر سے عمر بھر محترز رہے، اور یہ بھی نہ تھا کہ خلیفہء معنوی یعنی علی کرم اللہ وجہہ کے خوف سے منافقانہ یہ کام کرتے ہوں، کیوں کہ بقول حضرات شیعہ

یہ وہ زمانہ ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ ان کے خوف سے تقیہ کرتے تھے۔ پھر ایسی غالب قوم کو کیونکر کہا جائے کہ کل اسلامی کام وہ منافقانہ کرتے تھے۔ اگر ان حضرات کے اس قسم کے اسلام کو بھی کفر کہا جائے تو وہ بھی ایک اصطلاحی کفر ہوگا جس سے حقیقی کفر لازم نہیں آتا۔ اگر کوئی اس کو بھی تسلیم کر لے تو اس پر بھی فیصلہ کی امید نہیں، کیونکہ کہا جاتا ہے کہ سلوائے چار پانچ حضرات کے رسول اللہ ﷺ کے کل اصحاب پر لعنت کرنے کی ضرورت ہے اور ان کے بعد جب سے شیعہ کا سلسلہ قائم ہوا ہے ان کو چھوڑ کر سب امت قابل لعنت ہے۔ اس صورت میں سوائے اس کے اور کیا کہا جائے کہ ابن سبا کو جو منظور تھا کہ قیامت تک مسلمانوں میں مخالفت قائم رہے وہ پورا ہوا۔ ''انا للہ و انا الیہ راجعون''

یہود پر ایک سخت الزام یہ عائد تھا کہ موسی علیہ السلام کی وفات کے بعد ساٹھ سال کے اندر پوری قوم مرتد ہوگئی، اس الزام کو ابن سبا نے اس طرح ٹالا کہ وصی جو امام برحق ہوتا ہے اس کو نہ ماننے والا کافر ہے۔ غرضکہ جتنے لوگ علیؓ کے ہاتھ پر بیعت نہ کر کے ابوبکرؓ کی خلافت کے قائل ہوئے تھے وہ سب کافر ہوگئے۔

صرف مقداد، ابوذر، سلمان فارسی مسلمان تھے:

چنانچہ اسی بناء پر امام باقر علیہ السلام کا قول نقل کیا جاتا ہے جو ناسخ التواریخ کی جلد دوم میں ہے: از ابی جعفر علیہ السلام حدیث کنند: ''قال کان الناس أهل ردة بعد النبی صلی اللہ علیہ و آلہ الا ثلاثة، پرسش کردن یا ابن الرسول ﷺ آن سہ تن کیستند؟

قال: مفداد بن الاسود و ابوذر الغفاری و سلمان الفارسی انتھی۔

ابن سبا نے صحابہ کو کیوں بدنام کیا؟

موسیٰ علیہ السلام کی نسبت خیال ہو سکتا تھا کہ ان کی تعلیم ناقص تھی اس وجہ سے ان کی امت بہت جلد گمراہ ہوئی۔ اس کا دفعیہ ابن سبا نے یوں کیا کہ آنحضرت ﷺ کی امت میں جو اعلیٰ درجہ کے لوگ مانے جاتے ہیں مثلاً ابوبکر، عمر، عثمان، علی، ابوذر، سلمان، مقداد وغیرہ ھم۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ ان کی یہ حالت ہوئی کہ حضرت کی وفات کے ساتھ ہی آپس میں لعن طعن، سب و شتم ایسی ہوئی کہ بازاریوں میں بھی نہ ہو، اور دربار خلافت میں گھوسم گھانسا سے بھی تو بتر ھ گئی۔ چنانچہ ناسخ التواریخ صفحہ (۶۳) میں لکھا ہے کہ زبیر بن العوام ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرنا نہیں چاہتے تھے، ان پر تشدد کیا گیا یہاں تک کے عمر بن الخطاب، خالد بن ولید اور مغیرہ بن شعبہ کو، دے اور ان کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور عمر ان کو پچھاڑ کر سینہ پر چڑھ بیٹھے اور وہ نیچے پڑے ہوئے مغلظات سنا رہے تھے انتھی۔

یہ سب دربار خلافت میں ہو رہا تھا۔ ناسخ التواریخ میں ''احتجاج علی واصحاب او بعد از بیعت با ابوبکر و عمر'' وغیرہ مقامات دیکھنے سے صاف ظاہر ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے جو حسن خلق اور دیگر اخلاق حسنہ کی تعلیم دی تھی اور سب و شتم اور بدخلقی سے منع فرمایا تھا، آنحضرت ﷺ کے انتقال کے ساتھ ہی اس کا ذرا بھی اثر باقی نہ رہا۔ ان واقعات کو جب دوسری اقوام دیکھتی ہوں گی تو یہی کہتی ہوں گی کہ نعوذ باللہ یہ سب رذیل لوگ تھے کہ نبی کی تعلیم کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا ابن سبا کا بھی یہی مقصود تھا کہ جگ ہنسائی ہو۔

چونکہ عمرؓ نے خیبر وغیرہ مقامات سے یہود کو جلا وطن کر دیا تھا، اس لئے تمام یہود آپ پر دانت پیستے تھے۔ مگر بیچارے کیا کر سکتے، ان کے مقابلہ میں تو بڑے بڑے سلاطین سر جھکاتے تھے۔ آخر ابن سبا کو یہ موقعہ ملا کہ علی کرم اللہ وجہہ کا نام لے کر دل کھول کر گالیاں دیں اور موقع موقع کے قصہ تراشے اور حدیثیں بنائیں جیسا کہ ناسخ التواریخ صفحہ ۲۷ میں یہ روایت ہے ''**انا باذرؓ قال سالت رسول اللہ ﷺ عن حال عمرؓ فقال اکتموا انہ فرعون ھذہ الامۃ لا تخبروا بھذا من لم بحفظ العھد فی علی علیہ السلام**''

یعنی ابو ذر کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عمر بن الخطاب کا حال پوچھا۔ فرمایا یہ بات چھپا رکھو کہ وہ اس امت کا فرعون ہے اور جو علی علیہ السلام کا شیعہ نہ ہو اس کو اس بات کی خبر نہ دو انتہی ۔

معاہدہ ابوبکرؓ وغیرہ کا اہل بیت کو خلافت نہ دینے کے بارے میں:

سلمان فارسی سے اسی میں روایت کی گئی ہے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابوبکر، عمر، ابوعبیدہ، سالم اور معاذ بن جبل نے ایک معاہدہ لکھا اور کعبہ میں باہم معاہدہ کیا کہ جب محمد ﷺ مارے جائیں گے یا مر جائیں گے تو خلافت کو اہل بیت میں جانے نہ دیں۔ علیؓ نے پوچھا اس وقت مجھے کیا ارشاد ہے؟ فرمایا اگر مددگار لوگ ملیں تو ان سے جہاد کرو اور اگر نہ ملیں تو بیعت کر کے اپنی جان بچالو انتہی ۔

اس قسم کی روایتیں ناسخ التواریخ میں بکثرت مذکور ہیں۔ کیوں نہ ہو ابن سبا پہلے تو

یہودی، جس کو اپنی کتاب اسمانی میں تحریف اور کم وزیادتی کرنے کی کچھ پرواہ نہیں پھر حدیثوں کا بنالینا کیا مشکل۔ کوئی مسلمان ہوتو ایسی باتوں سے خوف کرے۔ پھر یہودی بھی کیسا دل جلا، جس کو دل کے پھپولے پھوڑنے کا کبھی موقع ملا ہی نہ تھا، اب موقعہ ملا تو ایسا کہ اہل بیت کرام کی زبان سے جو چاہے کہہ لے اور تصدیق کرنے والے بھی اپنی کمیٹی کے لوگ یا وہ بھولے بھالے مسلمان جن کو اہل بیت کی محبت میں خبر بھی نہ ہوئی کہ یہ دشمن ہے یا دوست، جس عیسی علیہ السلام کی محبت میں ان کی امت نے پولوس مقدس کی باتوں پر فریفتہ ہوکر ان کو خدا کا بیٹا تسلیم کرلیا۔

ابن سبا نے اہل بیت کو ذلیل کیوں ثابت کیا:

چونکہ عبداللہ بن سبا اور اس کی کمیٹی کے لوگ آیہ شریفہ ﴿**وضربت علیهم الذلة**﴾ وغیرہ پڑھا کرتے تھے جن میں یہود کی کمال ذلت کا حال مذکور ہے تو ضرور تھا کہ بمقتضائے بشریت وہ مسلمانوں سے انتقام لیتے مگر اسلام کی اس وقت وہ شوکت تھی کہ کوئی اس کے مقابلہ میں سر نہیں اٹھا سکتا تھا، ممکن نہ تھا کہ کسی قسم کی ذلت کی بات مسلمانوں کی کوئی کہہ سکے۔ ابن سبا آدمی کیا بلا کا پتلا تھا۔ اس نے ایک تدبیر ایسی سوچی کہ مسلمانوں کی ذلت تو کیا ان کے نبی کریم ﷺ کے اہل بیت کی ذلت وتوہین قیامت تک ہوا کرے، اور خود مسلمانوں کی شہادت سے وہ مستند ہو اور ان کو احساس تک نہ ہو کہ ہم کیا کررہے ہیں۔

اگر باور نہ ہو تو حضرت ام کلثوم علیہا السلام کے واقعہ کو دیکھ لیجئے کہ ناسخ التواریخ وغیرہ کتب کے ہزارہا نسخوں میں چھپکر شائع ہوگیا ہے۔ غیر ملت کے لوگ اس کو دیکھتے

ہوں گے تو کیا اہل بیت کو وقعت کی نظر سے دیکھتے ہوں گے؟ پھر یہ صرف ایک ہی قصہ نہیں جو اتفاق پر محمول ہو۔ بلکہ ہر موقعہ کا ایک نیا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔

علی اور فاطمہ علیھما السلام کی تذلیل:

چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہ ہے جو ناسخ التواریخ صفحہ (۵۵) کی جلد چہارم از کتاب دوم میں لکھا ہے کہ جب ابوبکر خلیفہ مقرر ہوئے تو علی علیہ السلام رات کو اندھیرے میں فاطمہ علیھا السلام کو گدھے پر سوار کر کے امام حسن اور حسین علیہم السلام کے ہاتھ پکڑ کے مہاجرین وانصار کے گھروں پر گئے اور ہر ایک کے دروازے پر کھڑے رہ کر فرماتے کہ میری مدد کرو۔ چنانچہ چوالیس (۴۴) شخصوں نے وعدہ کیا، آپ نے فرمایا: صبح سر منڈوا کر مسلح ہو کر کہ میرے یہاں آؤ اور موت پر بیعت کرو۔ مگر خوف کے مارے کوئی نہ آیا پھر دوسری رات بھی آپ اسی طرح گھر گھر تشریف لے گئے۔ اور لوگوں کی قسمیں دے دے کر آمادہ کیا۔ مگر کوئی آمادہ نہ ہوا آخر آپ قرآن جمع کرنے کے لئے مکان کا دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے۔ عمرؓ نے ابوبکرؓ سے کہا کہ اگر علیؓ بیعت نہ کریں گے تو خلافت کو استحکام نہ ہوگا۔ انہوں نے جب ان کو طلب کیا تو فرمایا: کیا جلدی لوگوں نے رسول خدا ﷺ پر جھوٹ باندھی ابوبکر اور جتنے لوگ ان کے گرد و پیش ہیں سب جانتے ہیں کہ خدا اور رسول خدا نے مجھے خلیفہ مقرر کیا ہے۔ اسی قسم کے سوال و جواب بواسطہ بہت دیر تک ہوتے رہے دوسرے روز پھر عمرؓ نے ابوبکرؓ سے کہا کہ سب لوگ بیعت کر چکے، اب صرف علی مرتضیٰؓ اور چند لوگ باقی ہیں جس طرح ہوسکے وہ حاضر کئے جائیں۔ ابوبکرؓ نے کہا اس کام کے لئے کون

مناسب ہوگا؟ کہا قنفذ جو نہایت سخت اور بے مروت آدمی ہے۔ چنانچہ وہ ایک جماعت کے ساتھ علی علیہ السلام کے گھر بھیجا گیا مگر آپ نے اس کو گھر میں آنے نہ دیا۔ وہ واپس جا کر عمر سے کہا، انہوں نے کہا کہ اجازت کی کیا ضرورت، زبردستی گھر میں گھس جاؤ اور ان کو پکڑ لاؤ۔ مگر وہ اس بار بھی کامیاب نہ ہوا۔ اور کہلا بھیجا کہ فاطمہ علیہا السلام کہتی ہیں کہ میں اپنے گھر میں ہرگز آنے نہ دونگی۔ عمر نے غصہ سے کہا کہ عورتوں کو ان معاملات سے کیا تعلق؟ یہ کہکر اور چند آدمیوں کو فاطمہ علیہا السلام کے دروازہ پر بھیجا اور خود آکر باہر سے پکارے کہ اے علی! باہر نکلو اور خلیفۂ رسول خدا کے ہاتھ پر بیعت کرو ورنہ اس دروازے کو میں جلادوں گا۔ فاطمہ علیہا السلام اٹھیں اور کہا۔ اے عمر! تمہیں ہم سے کیا تعلق؟ کہا دروازہ کھولو ورنہ ہم اس کو جلادیں گے۔ انہوں نے کہا: اے عمر کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے جو بلا اجازت میرے گھر مس ی آتے ہو، عمر نے دیکھا کہ دروازہ کھلنے کی امید نہیں، لکڑیاں منگائیں اور آگ لگادی۔ جب کچھ جل گیا تو لات مار کر دروازے کو توڑا اور گھر میں گھس گئے۔ فاطمہ علیہا السلام یا ابتا یا رسول اللہ کہتی اور چیختی آگے آئیں اور فریاد کیں کہ اے رسول خدا ہماری خبر لیجئے۔ اس وقت ابن خطاب نے تلوار میان سمیت ان کے پہلو پر ماری پھر فاطمہ علیہا السلام نے فریاد کی۔ اس وقت ایک کوڑا ان کے ہاتھ پر مارا۔ فاطمہ نے فریاد کی کہ یارسول اللہ ﷺ ابوبکر اور عمر نے خدا کو چھوڑا اور دین سے پھر گئے۔ اس وقت علی علیہ السلام کو غصہ آیا اور عمر کو پکڑ کر زمین پر دے مارا اور ناک اور گردن کو ایسا دبایا کہ دم نکلجائے اور کہا حکم قضا اور رسول خدا کا عہد میرے ذمہ نہ ہوتا تو میرے دروازے پر نہ آسکتا۔ عمر نے دیکھا کہ شکار کی

طرح شیر کے پنجہ میں قید ہے، فریاد کر کے باہر کے لوگوں سے مدد چاہی۔ قنفذ دوڑ کر ابوبکر سے یہ حال بیان کیا، ان کو اندیشہ ہوا کہ مبادا کہیں علی تلوار کھینچ کر باہر نکل آئیں اور کچھ لوگ ان کے ساتھ ہولیں تو سخت فتنہ کا اندیشہ ہے، فوراً قنفذ کو واپس کیا اور کہا اس کا بندوبست رکھ کہ وہ نکلنے نہ پائیں، اور اگر یہ نہ ہوسکے تو گھر کو آگ لگادے۔ قنفذ دوڑا اور لوگوں کو لیکر گھر میں گھسا اور علی کے ہاتھ سے تلوار چھینا اور ان کے گلے میں رسی باندھ کر کھینچتا ہوا مسجد میں لیجانے لگا۔ فاطمہ علیہا السلام دروازہ پر کھڑی لوگوں کو روکتی تھیں اور علی علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ لیا تاکہ لوگوں کے ہاتھ سے ان کو چھڑا لے۔ قنفذ آگے بڑھ کر ایک کوڑا ان کے ہاتھ پر ایسا مارا کہ اس کا اثر نمایاں ہوگیا، جو ان کی وفات تک باقی تھا۔ پھر عمر کے حکم سے دروازہ کے پٹ کو اس زور سے دابا کہ فاطمہ علیہا السلام کی پسلی کی پڈیاں ٹوٹ گئیں اور حمل ساقط ہوگیا۔ اسی صاحبزادہ کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محسن قرار دیا تھا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ عمر بن خطاب اور مغیرہ بن شعبہ نے بالاتفاق اس پٹ پر زور لگایا جس سے فاطمہ علیہ السلام کی ہڈیاں ٹوٹیں۔ اس وقت فاطمہ نے علی علیہ السلام کا ہاتھ چھوڑا اور قنفذ وغیرہ ان کو کھینچتے ہوئے مسجد میں لے آئے' خالد بن ولید وغیرہ مہاجرین وانصار ابوبکر کے پاس بیٹھے تھے، علی علیہ السلام نے فرمایا خدا کی قسم اگر تلوار میرے ہاتھ میں ہوتی تو مجھے تم یہاں نہ لاسکتے۔ واللہ اگر چالیس آدمی میری رفاقت دیتے تو تمہاری ساری جماعت کو میں متفرق کر دیتا، خدا ان لوگوں پر لعنت کرے جنھوں نے بیعت کر کے میری مدد نہ کی۔ امام باقر علیہ السلام خبر دیتے ہیں کہ اس وقت جتنے مسلمان تھے سوائے تین شخصوں

یعنی مقداد، ابوذر اور سلمان فارسی کے کل مرتد ہو گئے تھے۔ غرضکہ علی علیہ السلام کو جب اس ذلت سے ابوبکر کے روبرو لے گئے تو فاطمہ علیہا السلام نہایت خستہ اور پریشان حال گھر سے نکلیں اور تمام بنی ہاشم کی عورتیں آپ کے ساتھ تھیں، آپ آنحضرت ﷺ کی قبر پر حاضر ہوئیں۔ اور کہا کہ میرے چچا کے لڑکے یعنی علی علیہ السلام کو چھوڑ دو ورنہ میں اپنے بالوں کو بکھیروں گی۔ اور رسول ﷺ کا قمیص اپنے سر پر رکھوں گی اور خدا کی طرف رجوع کر کے چیخوں گی۔ کیا صالح علیہ السلام کی اونٹنی شرافت میں مجھ سے زیادہ تھی یا اس کا بچہ میرے بچوں سے افضل تھا؟ علی علیہ السلام نے سلمان سے کہا دیکھو محمد ﷺ کی لڑکی کے پاس جاؤ میں دیکھ رہا ہوں کہ مدینہ دو طرف سے زیروزبر ہو رہا ہے۔ سلمان نیچا کر کہا اے پیغمبر کی صاحبزادی (خدا نے تمہارے باپ کو رحمت عالم پیدا کیا تھا، اس خیال سے باز آؤ فرمائیں: اے سلمان تم نہیں دیکھتے کہ یہ لوگ علی کو قتل کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اور وہ قتل ہوں گے تو میں صبر نہ کر سکوں گی۔ چھوڑو مجھے، خدا سے داد چاہنے دو۔ سلمان نے کہا خوف ہے کہ کہیں مدینہ زمین میں دھنس نہ جائے۔ اور علی علیہ السلام نے مجھ کو آپ کے پاس بھیجا اور یہ فرمایا ہے کہ آپ گھر چلے جائیں۔ چنانچہ وہ گھر تشریف لے گئیں۔ اور علی ابوبکر کے روبرو اسی حالت میں بیٹھے رہے کہ گلے میں رسی بندھی ہے اور ایک شخص اس کو پکڑا ہوا ہے اور آپ شکایت کر رہے ہیں اور ابوبکر کہہ رہے ہیں کہ اگر تم بیعت نہ کرو گے تو نہایت ذلت وخواری سے ہم تمہیں قتل کریں گے۔

اس قسم کے اور قصے بیان کر کے لکھا ہے کہ ابوبکر نے کہا اے علی اگر تم بیعت نہیں

کرتے تو میں تمہارا سر اڑا دیتا ہوں۔ آخر علی علیہ السلام نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا: الٰہی تو گواہ رہ، یہ کہہ کر ہاتھ دراز کیا اور بیعت کر لی انتہی۔

غور کیجئے اس قصہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روح مبارک پر کیسا صدمہ ہوتا ہوگا۔ وہ اسد اللہ الغالب جن کی شجاعت کا تھوڑا سا حال ہم اوپر لکھ آئے ہیں، کیا ممکن ہے کہ قنفذ نے آپ کے ہاتھ سے تلوار چھین کر معاذ اللہ آپ کے گلے میں رسی باندھی ہوگی اور وہ طاقت، وہ زور کہ قلعہ خیبر کے دروازے کو سپر بنالیا تھا، کچھ کام نہ آیا۔ اور خاص حضرت فاطمہ ؓ پر اجنبی لوگوں کے حملوں کو آپ معاذ اللہ حسرت کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں گے؟ ممکن نہیں کہ محبین اہل بیت کا خیال بھی اس قسم کی باتوں کی طرف منتقل ہوا ہو۔ یہ سب ابن سبا کی تراشیدہ باتیں ہیں جس نے علی کرم اللہ وجہہ کی الوہیت کو ایک فرقہ کے ذہن نشین کر دیا تھا، جواب تک موجود ہے۔ معلوم نہیں کہ کس سحر بیانی سے یہ امور لوگوں کے ذہن نشین کیا کہ کسی کو چوں و چرا کا موقعہ ہی نہ ملا اور جس طرح ایک جماعت نے آپ کی الوہیت کو مان لیا اسی طرح اس ذلت کو بھی باور کر لیا۔

جب اس قسم کی باتیں تسلیم کر لی گئی ہوں گی تو اس کا لازمی اثر یہی ہے کہ محبین اہل بیت میں سے بھی ان لوگوں نے کبار صحابہ پر لعن وسب وشتم کیا ہوگا، جو محض ناواقفی سے ابن سبا کی کمیٹیوں کے دام میں آ گئے تھے جس طرح علی الٰہی ایک فرقہ بن گیا، ناواقف محبین کا بھی ایک گروہ بن گیا اور سب وشتم یعنی تبراء داخل مذہب ہو گیا۔

اگر صرف نہج البلاغہ اور ناسخ التواریخ وغیرہ کتب سیر وتواریخ حضرات شیعہ ہی تعمق

نظر اور غور سے دیکھ لئے جائیں اور قرائن سے پوری پوری مدد لیکر آزدانہ رائے قائم کی جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ یہ کارخانہ ابن سبا کا جمایا ہوا ہے جس کی بناء ان واقعات پر ہے جن کو بداہت عقلی فرضی ثابت کرتی ہے۔

ابن سبا کی افتراء پردازیوں کے مقاصد:

اس کو ان افتراء پردرازیوں سے کئی مقصود تھے: پہلا یہ کہ خود ان لوگوں کی زبانی اہل بیت کرام کی بیحرمتی اور بے عزتی کے واقعات کہلوادے جو ان حضرات کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں تا کہ دوسرے اقوام ان واقعات کو صحیح سمجھ کر خاندان نبوت کی توہین کریں اور مضحکے اڑائیں۔ دوسرا یہ کہ کل صحابہ جو بہترین امت ہیں دوسرے اقوام کی نظروں میں ظالم، خائن، خودغرض بلکہ جامع صفات رذیلہ ثابت ہوں تا کہ ان کو یہ کہنے کا موقعہ مل جائے کہ یہ امت بدترین امم ہے۔ تیسرا یہ کہ کبار صحابہ پر تبراء ہوا کرے جس سے باہمی جدال وقتال کا ہنگامہ ہمیشہ گرم رہے۔ غرضکہ بولس صاحب کی طرح اس نے خوب ہی یہودیت کے جوہر دکھائے۔

پیشتر نہج البلاغۃ اور ناسخ التواریخ سے یہ روایت لکھی گئی ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ مہاجرین وانصار نے ابوبکر وعمر کو اپنا امام مقرر کیا۔ اور جس کو انہوں نے اپنا امام بنالیا اس سے خداراضی ہے۔ نہج البلاغۃ (ج ۱ ص ۲۵۰) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کلام منقول ہے: ”لله بلاد فلان، فقد قوم الاود، وداوی العمد، خلف الفتنة واقام السنة، ذهب نقی الثوب قليل العيب، اصاب خيرها، وسبق شرها

ادی الی اللہ طاعتہ و اتقاہ بحقہ ‘‘۔یعنی عمرؓ کی حکومت کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے طبیعتوں کی کجی کو نکالدیا، امراض باطنی کی دوائی کئے فتنہ کو پیچھے ڈالدیا، سنت قائم کی پاک دامن قلیل العیب سدھار سے خلافت کی، بھلائی حاصل کی، اس کے شر کو نزدیک نہ آنے دیا، خدائے تعالیٰ کی اطاعت کی اور حقوق الٰہی میں تقویٰ کرتے رہے انتہی ۔شارحین نے فلاں سے مراد عمرؓ لکھی ہے۔اور ناسخ التواریخ سے یہ روایت لکھی گئی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عمرؓ کی تعریف کی کہ انہوں نے امت میں عدل کیا۔ان روایتوں سے ثابت ہے کہ آپ نے اس زمانہ کی تعریف کی کہ وہ نہایت امن کا زمانہ تھا۔اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ایسے زمانے کے لوگوں کے ساتھ جو کوئی بدظنی کرے وہ ظالم ہے۔ چنانچہ نہج البلاغۃ (ج۲ص۱۰۱) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول نقل کیا ہے:’’اذا استولی الصلاح علی الزمان و اھلہ ثم اساء رجل الظن برجل لم تظھر منہ خزیۃ فقد ظلم‘‘ یعنی کسی زمانے پر اور اس زمانے کے لوگوں پر صلاح غالب ہو پھر کوئی شخص اس زمانے کے ایسے شخص کی نسبت بدگمانی کرے جس سے رسوائی ظاہر نہیں ہوئی تو اس نے ظلم کیا۔

صحابہ کا کمال ایمان اور اشاعت اسلام کے لئے ان کی جانفشانیاں

دیکھئے اس زمانے کے اہل اسلام نے اسلام کو ترقی دی اور کافروں کو رسوا کیا پھر ایسے لوگوں سے بدگمانی کیونکر جائز ہوگی!! حسب ارشاد حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدگمانی جائز نہ ہو تو سب وشتم کس قدر آپ کے خلاف مرضی ہوگا۔نہج البلاغۃ (ج۱ص۱۱۹) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول نقل کیا ہے: این القوم الذین دعوا الی الاسلام

فقبلوه وقرأوا القرآن فا حكموه و هيجوا الى القتال فولهوا وله اللقاح الى اولاد ها وسلبوا السيوف اغمادها واخذوا باطراف الارض زحفا زحفا وصفا صفّا، بعض هلك و بعض نجا، لا يبشرون بالا حياء ولا يعزون بالموتى.... اولئك اخوانى الذاهبون فحق لنا ان نظمأ اليهم و نعض الايدى على فراقهم۔

ترجمہ: کہاں گئے وہ لوگ جنہوں نے دعوت اسلام کو قبول کیا اور قرآن پڑھ کر اس کو مستحکم کرلیا، اور جنگ کے لئے جب ان سے کہا گیا تو وہ اس پر شفیتہ ہو گئے اور تلواروں کو میان سے علیحدہ کر دیا۔ اور لشکر لشکر اور صف صف ہو کر اطراف زمین کو فتح کرلیا، بعضے انتقال کر گئے اور بعضے نجات پائے، جو زندہ رہے ان کی زندگی سے خوشی نہ ہوئی اور جو مر گئے ان کی موت سے غم نہ ہوا، اس لئے کہ شہادت سب کو مطلوب تھی، وہ لوگ میرے بھائی ہیں ہم پر حق ہے کہ ان کے تشنہ رہیں اور ان کی جدائی پر اپنے ہاتھ کاٹیں انتہی۔

یہ سب صفات صحابہ کے تھے جنہوں نے عرب، عجم، عراق وشام وافریقہ فتح کرلیا تھا۔ کس حسرت سے ان کے فراق پر آپ افسوس ظاہر کر کے ان کی ملاقات کی تمنا فرمارہے ہیں۔ کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ یہ لوگ معاذ اللہ کفار تھے، جن کا مقام دوزخ ہوگا، اور حضرت ان سے ملنے کی تمنا فرماتے ہوں گے۔ جب خود علی کرم اللہ وجہہ کو ان حضرات سے اس قدر محبت اور تمنائے ملاقات ہو تو کل اہل اسلام کا فرض ہے کہ ان سے محبت رکھیں۔ اور ان کے لے دعائے خیر کیا کریں کیونکہ حضرت فرماتے ہیں: **فحق لنا ان**

نظمأ اليهم۔

یہ روایت ابھی نہج البلاغۃ سے نقل کی گئی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ:

''**حتی رایت راجعة الناس قد رجعت عن الاسلام یدعون الی محق دین محمد** صلی اللہ علیہ وسلم **فخشیت ان لم انصر الاسلام و اهله ان اری فیه ثلما او هلما** ''۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ابوبکرؓ کے ہاتھ پر لوگ بیعت کرنے لگے تو میں نے توقف کیا۔مگر جب دیکھا کہ بہت سے لوگ مرتد ہوگئے ۔اور دین اسلام کے مٹانے کی فکر میں ہیں تو میں نے بھی بیعت کر لی،اور اسلام اور اہل اسلام کی مدد کو ضروری سمجھا۔

اب کہیے کہ سوائے تین شخصوں کے اگر کل صحابہ مرتد ہوگئے تھے تو مرتدوں کی مدد کیسی؟ پھر اسی روایت میں ہے کہ آپ فرماتے ہیں: **فنهضت فی تلک الاحداث حتی زاح الباطل وزهق و اطمأن الدین و تنهنه** ''یعنی میں نے ان نئی باتوں کے دفع کرنے کے لئے اٹھا اور اہل اسلام کی ایسی مدد کی کہ باطل دفع ہوا اور دین اطمینان سے قائم ہوگیا۔اس سے ظاہر ہے کہ مرتدوں کی وجہ سے صرف نئی باتیں پیدا ہوئی تھیں ۔اور جب ان کی سرکوبی ہوگئی تو عارضی امور دفع ہوگئے ۔اور اسلام پھر اسی حالت پر آ گیا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا،جس کا مطلب یہ ہوا کہ ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں اہل اسلام اسی صداقت اسلامی پر تھے،جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھی ۔اگر اس کا بھی نام ممانہء ارتدادِ صحابہ رکھا جائے تو یہ کہنا پڑیگا کہ دین کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت تک کبھی اطمینان نصیب نہ ہوا اور باطل ہی کو فروغ رہا۔اس صورت میں یہ ارشاد خلاف

واقع ہوجاتا ہے۔ یہ روایت بھی نہج البلاغۃ سے ابھی نقل کی گئی ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ نے عمرؓ سے فرمایا: ''والعرب الیوم ان کانوا قلیلا فھم کثیرون بالاسلام عزیزون بالاجتماع ''یعنی اگرچہ عرب آج کے روز تھوڑے ہیں مگر مسلمان ہونے کی وجہ سے بہت ہیں اور اجتماع کی وجہ سے غالب ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت اس زمانے کے اہل اسلام کو اعلیٰ درجہ کے مسلمان سمجھتے تھے اس لئے کہ یہ اس وقت آپ نے فرمایا تھا کہ عمار بن یاسرؓ نے اسلامی فوج کی قلت اور کفار کی یہ کثرت لکھی تی کہ انہوں نے دیڑھ لاکھ فوج اور ستر سے زیادہ ہاتھی مقابلہ کے لئے تیار کئے ہیں۔ پھر آپ نے لشکر اسلام کی تعریف کی اور فرمایا کہ: ''اللہ منجز وعدہ و ناصر جندہ''۔ یعنی خدائے تعالی اپنا وعدہ پورا کریگا اور اپنے لشکر کی مدد فرمائیگا۔ کیا اتنی ثنا وصفت کے بعد بھی یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ سب کچھ سہی مگر وہ سب لوگ مرتد ہی تھے اس لئے کہ علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت کے قائل نہ تھے۔

آنحضرت ﷺ کے انتقال کے ساتھ ہی تقریبا کل ملک عرب باغی اور مرتد ہوگیا، صرف مدینہ منورہ اور مکہ معظّمہ میں اسلام رہ گیا تھا اور سوائے قبیلہ قریش اور ثقیف کے باقی قبائل میں اگر کچھ مسلمان تھے بھی تو پریشان اور پوشیدہ تھے۔ ایسے وقت میں معدودے چند صحابہ ابوبکرؓ کے حکم سے پہلے ملک عرب کو اس کے بعد عجم عراق، شام اور افریقہ کو فتح کرنے کے لئے نکلے، صرف ایک مسلیمہ کذاب نے چالیس ہزار کی فوج لے کران کا سخت مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ اسی طرح تقریبا کل قبائل اور شجعان عرب مقابلہ کرتے اور ہزیمت

اٹھاتے گئے۔ چنانچہ انہی صحابائے کرام نے تھوڑے سے عرصہ میں کل ملک عرب کو از سرنو فتح کرلیا، اور عجم اور شام وغیرہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ چنانچہ شمس التواریخ صفحہ (۶۷۱) میں لکھا ہے کہ صرف جناب فاروق اعظمؓ کے ممالک مقبوضہ کا رقبہ ۲۲ لاکھ ۵۱ ہزار تیس (۲۲۵۱۰۳۰) مربع میل تھا۔ مکہ معظّمہ سے شمال کی طرف (۱۰۳۶) ایک ہزار چھتیس میل مشرق کی طرف ایک ہزار ستیاسی (۱۰۸۷) میل، جنوب کے رخ (۴۸۳) چارسو تراسی میل اور مغرب سمت جدہ تک تھی۔ اس رقبہ میں عراق، جزیرہ شام، مصر، فارس، ارمینہ، آذربیجان، خوزستان، کرمان، خراسان، مکران، اور کچھ حصہ بلوچستان کا بھی شامل تھا۔ روم یعنی ایشیائے کوچک پر ۲۰ھ میں حملہ ہوا تھا۔ یہ وہ ملک ہیں کہ عرب کے سربرآوردہ لوگ گویا گداگری کے لئے وہاں جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ہر مقابلہ میں وہاں کے افسر بطور توہین صحابہ کو اس قسم کی باتیں سنا کر ان کی اصلی حالت یاد دلاتے اور وہ حضرات بھی اعتراف کرکے کہتے کہ بیشک ہم ایسے ہی تھے مگر ہمارے نبی ﷺ نے ہمارے حالات کی اصلاح کردی اور وعدہ فرمایا کہ ملک کسریٰ اور قیصر کو ہم لوگ فتح کرلیں گے۔

کسریٰ و قیصر کی سلطنتیں معمولی نہ تھیں اس زمانہ میں ان کو شہنشاہی کے دعوے تھے۔ ان کے ملک آباد، خزانہ مالا مال، فوجیں نہایت آراستہ، لاکھوں کے افواج قاہرہ معرکۂ کارزار میں لانے پر قادر تھے۔ چنانچہ جس قدر ان کے امکان میں تھا اپنی فوجی اور مالی قوتیں صرف کرکے انہوں نے مقابلہ کیا، اور صرف اپنی ہی قوتوں سے نہیں بلکہ دوسری سلطنتوں سے بھی مدد لی۔ چنانچہ ہرقل نے علاوہ اپنی کل افواج کے روس وغیرہ ممالک

یورپ کے سلاطین کو مذہبی جوش دلا کر مدد کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ ان کے افواج کثیرہ سے انہیں مسلمانوں کو لڑنا پڑا۔ ادھر شاہِ ایران نے چین سے فوجی مدد لی، غرضکہ صحابہ کرام نے عرب، عجم، چین، عراق، شام، روس اور افریقہ وغیرہ ممالک کے افواج قاہرہ سے مقابلہ کیا۔ اور وہ داد جوانمردی دی کہ سب سے مقابلہ کر کے مظفر و منصور ہوئے۔ ان لڑائیوں میں اہل اسلام کی فوج کہیں ایک لاکھ کی نظر نہ آئے گی۔ البتہ قادسیہ اور یرموک پر ساٹھ ہزار کی تعداد تھی مگر وہ بھی کب جبکہ مقابل کی فوج لاکھوں کی جمع ہوگئی۔ چنانچہ یرموک میں چار لاکھ ساٹھ ہزار (۴۶۰۰۰۰) کا لشکر جرار معرکہء کارزار میں موجود تھا۔ مگر اسی تھوڑی سی فوج سے کفار کے ایک لاکھ (۱۰۰۰۰۰) سپاہیوں کو قتل اور چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) کو زندہ گرفتار کیا اور جنگ انطاکیہ میں ستر ہزار (۷۰۰۰۰) کو قتل اور تیس ہزار (۳۰۰۰۰) کو گرفتار کیا۔ اسی پر اور معرکوں کو قیاس کر لیجئے کہ جہاں جس قدر کفار کی فوجیں زیادہ ہوئیں ان کے مقتول اور اسیر زیادہ ہوتے تھے۔ اب کہئے کہ کم و بیش ساٹھ ہزار فقراء نے لاکھوں کو قتل اور لاکھوں کو قید کر کے ان سلطنتوں کو جو اس زمانے میں بے نظیر تھیں فتح کیا۔ کیا یہ بغیر تائید الٰہی کے ممکن ہے؟ ان کے سامان جنگ کی یہ کیفیت تھی کہ شمس التواریخ صفحہ ۶۲۲ میں لکھا ہے کہ پہلی لڑائی یرموک میں عربوں کے پاس البتہ زرہ تھی اور وہ بھی چمڑے کی، رکاب لکڑی کی، گھوڑا ہے تو کاٹھی نہیں، اونٹ ہے تو کجاوا ندارد، اسلحہ میں سے عرب گرز و کند جانتے ہی نہ تھے تیر ہوتے تھے، لیکن وہ بھی ایسے کہ جنگ قادسیہ میں جب ان کے تیروں کو کفار نے دیکھا تو انہیں بڑھیوں کے چرخوں کے تکلے بتایا۔ یہی ایک بات ان حضرات کے ایمان پر کھلی دلیل ہے

کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین ﴾یعنی اگرتم ایماندار ہوتو تم ہی غالب رہوگے۔

دیکھئے اس آیت شریفہ میں یہ بتلایا گیا کہ اگرتم مومن ہوتو تم غالب ہوگے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر غالب نہ ہوگے تو سمجھا جائیگا کہ مومن نہیں۔اسی خوف سے کہ کہیں مسلمانوں میں سے نام خارج نہ ہوجائے ایسی جانفشانیاں کیں کہ جن کی نظیر نہیں۔

ناسخ التواریخ میں لکھا ہے کہ خالد بن ولید نے ساٹھ (٦٠) شخصوں کولیکر ساٹھ ہزار (٦٠٠٠٠) جنگجو سپاہیوں کا مقابلہ کیا اور غالب رہے۔اگر خدانخواستہ ان حضرات کو فتح نہ ہوتی تو اس آیت کے لحاظ سے ان کے ایمان میں البتہ کسی قدر شک پڑ جاتا۔بخلاف اس کے کہ جب ان کا غلبہ ہوا تو اب ان کے ایمان میں کیا شک ہے۔غرضکہ اس آیت شریفہ سے ثابت ہے کہ ابوبکرؓ کے اوائل زمانہ خلافت سے عثمانؓ کے اواخر زمانہ تک ان حضرات کا کامل الایمان ہونا ثابت ہے، کیونکہ یہ سب فتوحات انہی زمانوں میں ہوئیں۔اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے میں وہ حضرات مومن نہ تھے یا ضعیف الایمان ہوگئے تھے، کیونکہ مفہوم مخالف ہے کوئی بات ثابت نہیں ہوتی۔اس دلیل سے اس کا خیال ردو ہوگیا جو کہا جاتا ہے کہ ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے کل مرتد ہوگئے تھے۔اور یہ آیت شریفہ بھی ان حضرات کے ایمان پر دلیل بیّن ہے۔قولہ تعالیٰ: ﴿وکان حقا علینا نصر المؤمنین ﴾یعنی ہم پر حق ہے کہ اہل ایمان کی مدد کریں۔حق تعالیومومنین کی مدد جو اپنے ذمہ لے رہا ہے اس میں صفت ایمان لحوظ ہے یعنی وہ لوگ جو

متصف بصفت ایمان ہوں ان کی مدد ایمان کی وجہ سے ہوگی جس کا مطلب یہ ہوا کہ مومن اگر جلا ہا ہو تو اس کی صفت کی حیثیت سے اس کی مدد ہونی ضرور نہیں۔ اب دیکھئے کہ صحابہ کی کیسی کیسی غیبی مددیں ہوئیں کہ عقل ان کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک ان کا ایمان کامل ثابت تھا، اس لئے ان کی مدد کر کے اپنا حق ادا فرما دیا اسی کو دیکھ لیجئے کہ اس زمانہ میں ساٹھ ستر ہزار مسلمانوں کو ایسی مدد ہوئی کہ روئے زمین کی بڑی بڑی سلطنتوں کو فتح کرلیا۔ اور اس وقت باوجود یہ کہ کروڑوں مسلمان موجود ہیں مگر ممالک مقبوضہ سابقہ کا سنبھالنا بھی دشوار ہے۔ اب کہئے کہ ہم لوگوں کو مومن کہنا چاہئے یا ان لوگوں کو؟ خدا تعالیٰ کے کلام سے تو یہی ثابت ہے کہ مومن وہی لوگ تھے جن کی مدد حسب وعدہ حق تعالیٰ نے ہر موقعہ میں کی۔ ناسخ التواریخ کے صفحہ (۲۷۷) جلد دوم میں لکھا ہے: ازاں سوئی حلیہ بنزدیک ماہان آمد وگفت کہ ایں عرب راازآسمان مدد میرسد کہ شصت تن برما شصت ہزار مردم درآمدند و کشعند انچہ کشتند و برما نصرت یافتند۔ اور نیز اسی صفحہ (۴۱۹) میں لکھا ہے: کافراں گفتند کہ شما فرشتگان آسمانید مادر پاسخ گفتیم فرشتگان نسیتم بلکہ ازآدمیانیم لاکن فرشتگان آسمان باما ہمراہ مند۔ دیکھئے کس قدر ان حضرات کا ایمانی جوش ہوگا کہ کفار نے ان کو ملائک تسلیم کرلیا تھا کہ خدا کے حکم سے ایک سرمو انحراف نہیں کرتے۔

ناسخ التواریخ صفحہ (۴۷۴) میں لکھا ہے کہ ماہان، ہرقل کی طرف سے چار لاکھ فوج لے کر میدان جنگ میں آیا، اور ساٹھ ہزار عرب متنصرہ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ خالد بن ولیدؓ نے کہا کہ ہم لوگ ان کے مقابلہ میں بہت کم ہیں، اس لئے اپنا رعب قائم کرنے کیلئے

میں تیس (۳۰) آدمیوں سے ساٹھ ہزار عرب متنصرہ کا مقابلہ کرتا ہوں۔ ابوسفیان وغیرہ کے کہنے سے اور تیس شخص اضافہ کئے گئے چنانچہ ساٹھ شخصوں نے ساٹھ ہزار کا مقابلہ کیا جس سے کفار کے دل دہل گئے۔ اس کے بعد لشکر اسلام نے ان کی کل فوج کا مقابل کیا اور فتح پائی۔ غور کیجئے کہ ساٹھ شخصوں کو ساٹھ ہزار سے نسبت ہی کیا پھر جن کے ساتھ مقابلہ تھا وہ بھی شجاعان عرب تھے۔ اگر صرف شجاعت ہی ہر غلبہ کا مدار ہوتا تو ہزار شجاع کے مقابلہ میں ایک جوانمرد شخص کیا کر سکے دیکھئے یہ ان کے ایمان کا وثوق تھا کہ نبی کریم ﷺ نے جو وعدہ فرمایا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ جہاد کو وہ فقط ظاہری حیلہ سمجھتے تھے ورنہ ان کی ایمان قوت کے مشاہدے میں وہ ممالک قبل از جنگ مفتوحہ شمار کئے جاتے تھے۔ اگر ایسے ایماندار لوگ معاذ اللہ بے ایمان اور مرتد سمجھے جائیں تو اس سے بڑھ کر اور کیا جرم ہو سکتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنی خلافت کی حقانیت اور ثبوت پر ہمیشہ یہی دلیل پیش فرمایا کرتے تھے کہ میرے ہاتھ ان اہل حل وعقد نے بیعت کی ہے جنہوں نے ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو بیعت کر کے خلیفہ اور امیر المومنین بنایا تھا اور جن کو خلیفہ بنانے کا حق تھا۔ اس سے ثابت ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ ان حضرات کو اعلی درجہ کے ایماندار سمجھتے تھے۔ اگر یہ لوگ اس زمانہ میں کفار سمجھے جاتے تو اہل شام صاف جواب دیتے کہ حضرت کافروں کی بیعت کا اعتبار ہی کیا، کیونکہ وہ تو بیعت کی وجہ سے مرتد ہو گئے تھے اور علی کرم اللہ وجہہ کا استدلال بے موقع ہو جاتا۔

اب یہ بی دیکھ لیجئے کہ کیسے کیسے امور خیر ان حضرات کے ہاتھوں پر جاری ہوئے۔

ان حضرات نے خلفاء مقرر کئے جن سے اسلام کی اشاعت ہوئی۔ جانیں لڑا لڑا کر بڑی بڑی سلطنتیں اسلامی حدود میں داخل کرلیں، اعلائے کلمۃ اللہ میں وہ کوششیں کیں کہ ان کے بعد کسی سے نہ ہوسکیں۔ وہ لوگ اکثر شوکت اور کثرت کفار کو دیکھ کر ہمت ہار دیتے تو اسلام کا ہم تک پہونچنا تو درکنار، ملک عرب ہی میں اس کا رہنا دشوار ہوجاتا۔ اب غور کیجئے کہ جس قسم کے کارخیر ان حضرات کے ہاتھوں پر جاری ہوئے۔ کیا اور کسی سے ہوسکتے ؟ ممکن نہیں۔ پھر ایسے لوگ اگر مرتد شمار کئے جائیں تو معلوم نہیں مسلمان کون سمجھا جائیگا۔ کلینی صفحہ (۸۹۰) میں یہ روایت ہے: ''عن معاوية بن وهب قال سمعت ابا عبدالله يقول انما اوحى الله الى موسى و أنزل عليه فى التورا انى انا الله لا اله الا انا خلقت الخلق و خلقت الخير و اجريته على يدى من احب، فطربى لمن اجريته على يديه، وانا الله لا اله الا انا خلقت الخلق و خلقت الشر و اجريته على يدى من اربده فويل لمن اجريته على يديه'' یعنی خدا تعالیٰ نے موسی علیہ السلام پر وحی کی کہ میں نے مخلوق کو پیدا کیا، اور خیر پیدا کر کے اس کے ہاتھ پر جاری کی جس کو میں دوست رکھتا ہوں، اور شر پیدا کر کے جس کے ہاتھ پر چاہا اس کو جاری کیا اور ویل اور خرابی ہے اس کی جس کے ہاتھ میں نے شر جاری کی۔ اور یہ روایت بھی اسی کے صفحہ ۸۹ میں ہے: ''عن محمد بن مسلم قال سمعت ابا جعفر عليه السلام يقول ان فى بعض ما انزل الله من كتبه انى انا الله لا اله الا انا خلقت الخير و خلت الشر فطوبى لمن اجريت على يديه الخيرو ويل لمن

اجريت على يديه الشر و ويل لمن يقول كيف ذا و كيف ذا‘‘۔

یہ بھی مضمون اسی روایت سابقہ کا ہے،صرف زیادتی اس میں اسی قدر ہے کہ اگر کوئی کہے کہ خدائے تعالیٰ نے خیراورشر خود ہی پیدا کئے۔اورجس کے ہاتھ پر خیر جاری کی اس کوخوشخبری اور بشارت اورجس کے ہاتھ پر شر جاری کی اس کوویل، یہ کیونکر ہوسکے؟ تو ایسے شخص کے لئے بھی ویل ہے۔دیکھئے کہ ان احادیث سے ثابت ہے کہ جن کے ہاتھ پر کارخیر جاری ہوئے وہ محبوبان الٰہی تھے۔یوں تو وہ حضرات پہلے ہی سے محبوبان بارگاہ کبریائی تھے مگران امور کی ابتداء ابوبکرؓ کی ابتدائے خلافت سے ہوئی اس لئے یہ تازہ محبوبیت یایوں کہئے کہ ترقی مدارج محبوبیت اسی زمانہ سے ہوئی جوزمانہء ارتداد بتلایا جاتا ہے غرضکہ ائمہ کبار کے ارشادات اوروحی الٰہی سے ثابت ہے کہ صدیق اکبرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے خدا تعالیٰ کے محبوب تھے۔اب کہئے کہ جس چیز سے وہ محبوب الٰہی ہوئے اسی کو باعث ارتداد کیونکرسمجھ سکیں۔

کلینی صفحہ(۳۷)میں روایت ہے’’عن منصور بن حازم قال قلت لابی عبدالله فاخبرنی عن اصحاب محمد ﷺ صدقوا عن محمد ام كذبوا؟ قال صدقوا الحديث ‘‘یعنی منصور کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ علیہ السلام سے پوچھا کہ اصحاب محمدﷺ حدیثوں میں راست گو تھے یا جھوٹ کہتے تھے؟ فرمایا: وہ لوگ سچے تھے۔دیکھئے جس شخص کے تدین میں ذرابھی شک ہواس کی روایت قابل اعتمادنہیں ہوسکتی، چہ جائیکہ سرے سے ایمان ہی نہ ہو۔جب ائمہ کرام نے صحابہ کوصادق اوران کی روایتوں کو

قابل وثوق سمجھا تو کس وضاحت سے ان کا کامل الایمان اور متدین ہونا ثابت ہوگیا۔ غرضکہ بحسب روایات مذکورہ جب صحابہ کی حالت ان کے کمال ایمان پر گواہی دے رہی ہے اور خود علی کرم اللہ وجہہ اور ائمہ کرام کے متعدد ارشادوں سے ان کا ایمان ثابت ہے۔ اور قرآن شریف ان کے ایمان پر شاہد عدل ہے اور ان کی حالت یہ تھی کہ کفار بھی ان کے حالات کو دیکھ کر بول اٹھتے تھے کہ وہ اعلی درجہ کے ایماندار بلکہ ملائک ہیں۔ تو ہم کبھی خیال نہیں کرسکتے کہ ابتداء مسلمانوں نے ان کو مرتد اور بے ایمان کہا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس قول کا موجد اور اس اعتقاد کا بانی ضرور ابن سبا تھا جس کا یہودی اور منافق ہونا حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر ائمہ کرام کے اقوال سے ثابت ہے یہاں تک کہ ان حضرات نے اس پر لعنت بھی کی جب اس کے صدہا بلکہ ہزارہا ہم خیالوں نے نئے نئے واقعات تراش کر ان کو مرتد مشہور کیا تو شدہ شدہ بعض بھولے بھالے مسلمان بھی اس وقت ان کے ہم خیال ہوگئے اور وہ مہتم بالشان مسئلہ بن گیا۔

متعدد قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام جو اس وقت اصلی شیعۂ علی کرم اللہ وجہہ تھے وہ ہرگز تبراء کے قاءنہ ہوں گے کیونکہ خدا تعالی فرماتا ہے: ﴿ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ ﴾ یعنی بتوں کو گالیاں مت دو ورنہ بت پرست خدا کو گالیاں دیں گے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ نے بھی متعدد حدیثوں میں لعن طعن، فحش کلامی اور تکفیر سے منع فرمایا۔ اور خود علی کرم اللہ وجہہ نے بھی اس سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ناسخ التواریخ صفحہ (۱۰۰) جلد سوم میں لکھا ہے کہ: عبداللہ بن وہب الراسی گفت سوگند

بخدائیکہ آنجماعت باتو مقابلت کردند از اہل بغی وظلم بودند کافر ومشرک اند علی علیہ السلام فرمود بر باطل سخن مگو این قوم نہ چنان اند تو گوئی اگر کافر ومشرک بودن اموال ایشان را بہ غیمت بالیت برگرفت وزنان ایشاں را نکاح توانست کرد انتہی ۔

علی کرم اللہ وجہہ نے تکفیر سے منع فرمایا:

دیکھئے خوارج باوجودیکہ علی کرم اللہ وجہہ کو کافر کہتے تھے مگر آپ نے ان کو بھی کافر نہیں فرمایا، بلکہ تکفیر کرنے والوں کو زجر کیا اور ناسخ التواریخ صفحہ (۱۰۶) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول نقل کیا ہے: ''**لایزال امرنا متماسکا مالم یشتم آخر نا اولنا و اذا خالفآ خرنا اولنا و افسدوا هلكوا و اهلكوا**'' ۔یعنی آپ نے فرمایا کہ ہمارے دین کا کام اسی وقت تک مستحکم رہے گا کہ بعد والے ہمارے اول والوں کو گالی نہ دیں ۔اور جب بعد والے اول والوں کی مخالفت کریں اور فساد کریں تو خود بھی ہلاک ہوں گے اور دوسروں کو بھی ہلاک کریں گے ۔اب دیکھئے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اول والے کون تھے جن کی مخالفت اور سب وشتم سے آپ نے روکا؟ وہی خلفائے ثلاثہ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے تھے ۔گویا آپ نے صاف فرمادیا کہ ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی دشمنی ہلاک ہونے اور ہلاک کرنے کا باعث ہے، اور ان کو گالیاں دینا باعث زوال دولت ہے ۔اور نیز ناسخ التواریخ صفحہ (۱۸۰) میں ہے: حجر بن عدی وعمرو بن الحمق بلعن وشتم معاویہ واہل شام زبان کشوند و این سخن بہ علی علیہ السلام سید ایشان را حاضر ساخت وفرمود ازیں گونہ سخن مکنید گفتند یا امیر المومنین! ایا ما برحق نیستیم وایشاں بر ما باطل نیتند فرمودہ

حسین است گفتند پس چرا لعن و شتم ایشاں را روا نمید اری فرمود مروہ میدارم ناستودہ ایشاں باز گوید نکور باشد و بجائے لعن براءت از ایشان بجوئید۔''اللھم احقن دمائنا و دمائھم و اصلح یعرف الحق منھم من جھله و یرغی من ضلالتھم حتی یعرف الحق منھم من جھله و برعی من الغی و العدوان من لھج به ''۔یعنی خدایا! حفظ فرمائے خون مارا و خون ایشاں را و ایں مخاصمت کہ درمیان ماست بمسلمیت بدل کن وایشان راز طریق ضلالت و غوایت بشاہراہ حقیقت و ہدایت دلالت بنمائے منجملہ فرمود اگر این چنین سخن کنید من او دست تر دارم واز برائے شانکوتر است گفتند یا امیر المومنین چنان کنیم کہ تو فرمائی انتھی ۔یہی روایت نہج البلاغہ صفحہ (۲۲۸) میں بھی مذکور ہے۔

دیکھئے معاویہ رضی اللہ عنہ اور اہل شام کو بھی گالیاں دینا علی کرم اللہ وجہہ کو نا گوار ہوا اور فرمایا میں اسے مکروہ سمجھتا ہوں کہ گالیاں دینے والوں میں تمہارا شمار ہو۔لعنت کی جگہ دعا کرو کہ صلح اور موافقت ہو جائے۔چونکہ وہ حضرات فی الواقع شیعہ تھے امیر المومنین کے حکم کو بصدق قبول کر کے اقرار کرلیا کہ آئندہ ایسی ناشائستہ حرکت کبھی نہ کریں گے۔اس سے ظاہر ہے کہ اہل سنت والجماعت نے جو طریقہ اختیار کیا ہے کہ کسی پر لعنت نہیں کرتے ،اس باب میں وہ علی کرم اللہ وجہہ کے پیرو ہیں۔کیونکہ لعنت کرنے کا طریقہ مروانیوں کا تھا جو مجلسوں میں بلکہ ممبروں پر لعنت کیا کرتے تھے۔

علیؓ نے عمرؓ کو برا کہنے سے منع فرمایا:

ناسخ التواریخ صفحہ ۲۵۹ میں لکھا ہے کہ جنگ صفین میں عبداللہ بن عمرؓ اور محمد بن

حنفیہ کا مقابلہ ہوا تو علی علیہ السلام نے پکار کر کہا۔ اے فرزند تم واپس آجاؤ میں ان سے مقابلہ کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ واپس آگئے اور پوچھا کہ آپ نے مجھے اس کے مقابلہ سے کیوں روکا؟ فرمایا احتمال تھا کہ وہ تم پر غالب ہو جائے کہا: خدا کی قسم یہ فاسق تو کیا اگر اس کا باپ عمر بن خطابؓ بھی آپ کے مقابلہ میں آتا تو آپ کی شان نہ تھی کہ اس کے مقابلہ میں جاتے۔ امیر المومنین نے فرمایا: ''یا بنی لا تقل لا بیه الا خیرا ''یعنی اے لڑکے ان کے باپ کو جب یاد کرو بھلائی سے یاد کرو انتہی۔

دیکھئے محمد بن حنفیہؒ نے عمرؓ کو نہ گالی دی نہ لعنت کی، صرف طرز کلام سے ان کی گستاخی پائی جاتی تھی مگر آپ کو وہ بھی ناگوار گذرا اور فرمایا کہ جب ان کا ذکر کرو بھلائی سے کرو۔ اب کہئے کیا یہ مناسب ہوگا کہ علی کرم اللہ وجہہ کا اتباع کرنے والے عمرؓ کو برائی سے یاد کریں؟۔

ناسخ التواریخ صفحہ (۶۳۲) میں لکھا ہے کہ ایک بار آپ نے یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ اگر کسی کو اجنبی عورت اچھی معلوم ہو تو چاہئے کہ اپنی بیوی کے پاس جائے اور یہ سمجھ لے کہ ایک عورت دوسری عورت کے جیسی ہوتی ہے۔ ایک خارجی اس مجلس میں بیٹھا تھا، بے ساختہ امیر المومنین کی شان میں کہہ دیا کہ خدا اس کافر کو قتل کرے کیسا بڑا افقیہ ہے۔ یہ سنتے ہی لوگوں نے چاہا کہ اس کو قتل کر ڈالیں۔ آپ نے فرمایا ''رویدا انما هو سب بسب او عفو عن ذنب ''یعنی فرمایا جلدی مت کرو تمہیں اس قدر حق ہے کہ ایک گالی کے بدلہ تم بھی ایک گالی دو یا اس کا گناہ معاف کر دو۔ اور یہی روایت نہج البلاغۃ صفحہ (۱۴۳) میں بھی

موجود ہے دیکھئے کہ اس مردود نے کس قدر توہین کی کہ امیر المومنین کو عین اجلاس میں سر مجلس کافر کہا مگر آپ نے اس کا بدلہ یہی ٹھیرایا کہ تم بھی ایک گالی دے دو یا معاف کر دو۔ یہ اس گالی کا حال ہے جس کو سب نے سنا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جو فرمایا: ''سب بسب او عفو عن ذنب '' یہ اس آیت شریفہ کی طرف اشارہ ہے جو حق تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿و جزاء سیئة سئة مثلها فمن عفا و اصلح فاجره علی الله ﴾ یعنی برائی کے بدلہ ایک برائی ہو، وہ بھی اسی کی جیسی پھر اگر وہ بھی معاف کر دی جائے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ اب اگر علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت ان حضرات نے چھینی بھی تو آپ کو حق تھا کہ ان کی خلافت چھین لیتے یا معاف کر دیتے دوسروں کو یہ حق نہیں۔

کلینی صفحہ (۵۱۷) میں روایت ہے کہ ابو جعفر علیہ السلام نے فرمایا کہ تم میں بدتر وہ شخص ہے جو کسی کو کچھ نہ دے اور اپنے غلام کو مارے اور اکیلا کھائے لوگوں نے سمجھا کہ اس شخص سے بدتر کوئی نہ ہوگا پھر فرمایا اس سے بھی بدتر وہ شخص ہے کہ اس سے خیر کی کسی کو امید نہ ہو اور اس کے شر کا لوگوں کو خوف رہے۔ لوگوں نے گمان کیا اب اس سے بدتر کوئی نہ ہوگا۔ پھر فرمایا کیا اس سے بدتر بھی بیان کروں؟ لوگوں نے کہا ارشاد ہو فرمایا: ''المتفحش اللعان'' یعنی بدگو اور لعنت کرنے والا انتہی ملخصا۔

دیکھئے ابن سبا نے مختلف تدابیر سے صحابہ پر لعنت کرنے کی جو تجویز کی اس میں علاوہ اس کے کہ مسلمانوں میں مخالفت پیدا ہو، ایک بڑا نقصان یہ بھی ہے کہ اس حدیث کے مطابق آدمی بدترین خلق بن جاتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ جب یہ حدیث

ائمہ کرام میں نقل ہوتی ہوئی امام ابو جعفر رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ضرور اس کا علم تھا۔ پھر جو کہا جاتا ہے کہ آپ نے فلاں فلاں پر لعنت کی۔ وہ روایتیں کیوں کر صحیح مانی جائیں اور یہ کیونکر کہا جائے کہ علی کرم اللہ وجہہ معاذ اللہ لعان تھے۔ ناسخ التواریخ کی جلد سوم صفحہ ۱۰۷ میں امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کا قول نقل کیا ہے کہ ''**لا یزال امرنا متماسکا مالم یشتم آخرنا اولنا**''۔ یعنی ہمارا دین و آئین اس وقت تک مستحکم رہے گا کہ آخر والے اول والوں کو گالیاں نہ دیں۔ اس لئے مسلمانوں میں اتفاق اور دین کے کاموں میں استحکام رہا، اس کے بعد جب سب وشتم صحابہ پر شروع ہوئی دین کے استحکام میں زوال آگیا۔ غرضکہ یہ طریقہ سب وشتم ولعن طعن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بالکل خلاف مرضی ہے۔

کلینی صفحہ (۵۴۷) میں روایت ہے: ''**عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سباب المومن کالمشرف علی الھلکۃ**'' یعنی مسلمان کو گالی دینے والا اس شخص کے جیسا ہے کہ ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے قریب ہوا۔ انتہی۔

کلینی میں رواتی ہے کہ ابوعبداللہ علیہ السلام نے سماعہ سے فرمایا کہ تم فحش گوئی اور لعن سے بچتے رہو، نہ وہ میرا کام ہے اور نہ میں نے اپنے شیعہ کو اس کا حکم کیا۔

اور نیز کلینی صفحہ (۵۴۸) میں روایت ہے کہ ابو جعفر علیہ السلام نے فرمایا کہ لعنت جس وقت کسی کے منہ سے نکلتی ہے تو وہ دونوں میں متردد ہوتی ہے، اگر اس نے موقعہ پایا تو

شخص ملعون پر گئی ورنہ لعنت کرنے والے پر لوٹ آتی ہے۔ انتہی۔

"**فایا کم الطعن علی المومنیحن**" یعنی مسلمانوں پر طعن کرنے سے بچتے رہو۔ انتہی۔ مطلب یہ کہ لعنت تو بڑی چیز ہے کسی پر طعن بھی نہ کرو۔ اس کالم یہ ہے جو کلینی صفحہ (۸۸) میں مذکور ہے کہ ابو عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے سعادت وشقاوت کو پیدا کیا۔ جس کو سعید پیدا کیا اس سے کبھی بغض نہیں رکھتا، اگر وہ برا کام کرے تو صرف اس کے اس فعل سے بغض رکھتا ہے اس کی ذات سے بغض نہیں رکھتا انتہی ملخصا۔

اب دیکھئے صحابہ نے جس قدر جانفشانیاں آنحضرت ﷺ کے ساتھ کیں ظاہر ہیں۔ پھر تمام عمر اشاعت دین میں مشغول رہے۔ یہ تمام آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس وقت کے تمام لوگوں میں سے خدائے تعالیٰ نے ان حضرات کو اس کام کیلئے منتخب فرمایا تھا، اگر بمقتضائے بشریت ایک آدھ کام برا بھی ہو گیا تو کوئی یقیناً نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کام کی وجہ سے شقی ازلی تھے۔ پھر باوجود اس کے کہ سعادت کے قرائن کثرت سے موجود ہوں ان پر لعنت کرنا جس کا مطلب یہ ہے کہ رحمت الٰہی سے وہ دور ہیں، کیونکر جائز ہوگا اسی وجہ سے اہل سنت کسی مسلمان پر لعنت کرنے کو جائز نہیں رکھتے۔

نہج البلاغۃ صفحہ (۱۳۴) میں امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد نقل کیا ہے "**یا عبداللہ لا تعجل فی عیب احد بذنبه فلعله مغفور**" یعنی کوئی اگر گناہ کرے تو اس کی عیب گوئی میں جلدی نہ کرو شاید کہ خدائے تعالیٰ نے اسے بخش دیا ہو اب کہئے کہ گناہ

کا عیب لگانا جب بحسب ارشاد امیر المومنین جائز نہ ہوا تو لعنت کرنی کیونکر جائز ہوگی۔
کلینی صفحہ (۵۷۳) میں روایت ہے کہ ابو جعفر علیہ السلام نے فرمایا کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سے ایک بار شکایت کی کہ جب تک ہم آپ کی خدمت میں رہتے ہیں ہماری حالت ہی دوسری رہتی ہے، اس سے ہمیں خوف ہوتا ہے کہ کہیں منافق نہ ہوں۔ فرمایا کہ اگر تمہاری وہ حالت ہمیشہ رہے تو فرشتے تم سے مصافحہ کیا کریں اور تم پانی پر چلنے لگو گے۔ تم لوگ گناہ کرتے ہو استغفار بھی کرتے ہو، اگر تمہاری یہ حالت نہ ہوتی تو خدائے تعالیٰ ایک ایسی خلق کو پیدا کرتا کہ وہ گناہ کرتی اور استغفار کرتی جس کی وجہ سے خدائے تعالی اسے بخش دیتا۔ یہ روایت فریقین کی صحیح کتابوں میں موجود ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ مسلمان کا گناہ کرنا اور اس کے بعد استغفار کرنا حق تعالی کو نہایت پسند ہے تاکہ صفت مغفرت کا ظہور ہو۔ تعجب نہیں کہ صحابہ اسی وجہ سے کبھی کبھی گناہ بھی کر لیتے ہوں، تاکہ استغفار کریں اور مغفرت الٰہی کے مستحق ہوں جو باعث خوشنودی الٰہی ہے۔ اب صرف گناہ کی وجہ سے ان کو کافر سمجھنا اور لعنت کرنا کس قدر خلاف مرضی الٰہی ہوگا۔ کیونکہ جو امر باعث خوشنودی الٰہی ہے وہ باعث لعنت بنایا جارہا ہے۔

ابن تیمیہؒ نے منہاج السنہ جلد دوم صفحہ (۳۰۳) میں لکھا ہے کہ مسور بن مخرمہؓ ایک بار معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس اعتراض کی غرض سے گئے۔ آپ نے تخلیہ کر کے ان سے پوچھا کہ مجھ پر جو کچھ الزام لگائے جاتے ہیں بیان کیجئے۔ انہوں نے بیان کیا۔ معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا یہ سب صحیح مگر میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے بھی کچھ گناہ کئے ہیں یا نہیں؟ کہا

کیوں نہیں، فرمایا کیا آپ مغفرت کی امید رکھتے ہو؟ کہا ہاں فرمایا کس چیز نے مجھ سے زیادہ امیدوار مغفرت بنایا حالانکہ میں نے جہاد کیا حدود اللہ قائم کئے، **امر بالمعروف اور نھی عن المنکر** کیا اور یہ سب چیزیں آپ کے اعمال سے افضل ہیں اور میں ایسے دین پر ہوں جو حسنات کو قبول کرتا ہے اور سیئات سے تجاوز کرتا ہے۔ اب کہیئے کہ مجھے مغفرت سے مایوسی یا آپ سے کم امید ہونے کی کیا وجہ؟ مسور کہتے ہیں کہ مجھ سے اس کا جواب نہ ہوسکا۔ کسی سید صاحب نے جواز لعن معاویہ رضی اللہ عنہ میں ایک کتاب لکھی ہے، اس میں کتاب الاکلیل مولفہء ہمدانی سے نقل کیا ہے کہ ایک روز معاویہ رضی اللہ عنہ ہم نشینوں کے ساتھ بیٹھے تھے، ان سے کہا کہ جو شخص علی کرم اللہ وجہہ میں جو اوصاف تھے بیان کرے تو اس کو میں یہ بدرہ دونگا۔ لوگوں نے حسب عادت جو اس زمانہ میں علی کرم اللہ وجہہ پر لعن طعن ہوا کرتی تھی اشعار میں لکھے اور عمرو بن عاصؓ نے بھی ایک قصیدہ لکھا جس کے اشعار یہ ہیں:

بآل محمد عرف الثواب — و فی ابیاتھم نزل الکتاب

و ھم حجج الالہ علی البرایا — بھم و بجدھم لا یستراب

ولا سیما ابو حسن علی — لہ فی المجد مرتبۃ تھاب

او اطلبت صوارمہ نفوسا — فلیس لھم سواء نعم جواب

و حربتہ کبیعتہ نجم — و فیض دم الرقاب بھا شراب

و حربتہ کبیعتہ نجم — معاقدھا من الناس الرقاب

اذالم تبرأ من اعدا علی — فمالک فی مجتہ ثواب
ھو البکاء فی المحراب لیلا — ھو الضحاک ان آن الضراب
ھو النبأ لعظیم و فلک نوح — و تاب الیہ و انقطع الجواب

جب عمرو بن عاصؓ نے یہ قصیدہ پڑھا جس میں اہل بیت کرام خصوصاً علی کرم اللہ وجہہ کے مناقب اور مرتبہ اور عبادت و شجاعت وغیرہ اوصاف مذکور ہیں، معاویہؓ نے وہ بدرہ انہیں کو دیا۔ غور کیجئے کہ مقتضائے وقت تو یہ تھا کہ جس طرح علی کرم اللہ وجہہ کی کسر شان اس زمانہ میں کی جاتی تھی بمقتضائے بادشاہی و رعب شاہی مذمتیں لکھی جاتیں۔ چنانچہ اسی بناء پر لوگوں نے اشعار لکھے جن میں سب و شتم اور لعن طعن تھی۔ مگر عمرو بن عاصؓ نے جو آزادانہ قصیدہ مدحیہ لکھا وہی مقبول اور قابل تحسین ٹھیرا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے دلوں میں کوئی مخالفت نہ تھی بلکہ ایک دوسرے کے فضائل کے معترف تھے۔

منہاج السنہ میں ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ گناہ ہر چند سبب عذاب ہیں مگر عقوبت اخروی دس چیزوں سے دفع ہو جاتی ہے: (۱) توبہ (۲) استغفار (۳) اعمال صالحہ (۴) مسلمانوں کی دعا (۵) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اور استغفار زندگی میں اور وفات شریف کے بعد جس طرح آپ قیامت میں شفاعت بھی کریں گے۔ (۶) موت کے بعد جو ایصال ثواب کیا جاتا ہے (۷) مصائب دنیا (۸) قبر میں ضغطہ وغیرہ کا ہونا (۹) قیامت میں جو ہول اور سختیاں پیش آئیں گی (۱۰) قیامت میں پلصراط سے گذرنے کے بعد ایک دوسرے سے جو قصاص لیا جائیگا۔

ابن تیمیہؒ نے آیات اور احادیث سے ثابت کیا ہے کہ یہ امور دفع عذاب الٰہی کے باعث ہیں جب عامہ مومنین کے لئے وہ کفارۂ سیئات ہیں تو صحابہ تو بطریق اولی اس کے مستحق ہیں جنہوں نے اشاعت دین کر کے خوشنودی خدا اور رسول کا تمغہ حاصل کیا تھا۔ اتنے ذرائع مغفرت کے قائم ہونے کے بعد بھی کسی صحابی یا مسلمان پر لعنت کی جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ رحمت الٰہی سے وہ بالکل دور ہے تو کہئے کہ کس قدر مرضی الٰہی کے خلاف ہوگا۔ دیکھئے وہاں تو مغفرت کے ذرائع کثرت سے قائم کئے جارہے ہیں یہاں تک کہ تمام ملائکہ مقربین مسلمانوں کی مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں ''کما قال تعالی ﴿الذین یحملون العرش و من حولہ یسبحون بحمد ربھم و یؤ منون بہ و یستغفرون للذین امنوا﴾ (المؤمن، ۷) والملئکۃ یسبحون بحمد ربھم و یستغرون لمن فی الارض﴾ (شوریٰ، ۵) '' اور تمام انبیاء اور اولیاء وغیرہم مامور ہیں کہ خاص خاص وقتوں میں خصوصاً نماز میں'' ﴿رب اغفر للمؤمنین والمؤمنات ﴾'' کہہ کہہ کر تمام مسلمانوں کو بخشوادیں اور لعنت کرنے والے صاحب کا مقصود یہ ہے کہ نہ کوئی ذریعہ کام آئے نہ کسی کی دعا اس کے حق میں مقبول ہو، یہی وجہ لعنت کے رجوع کرنے کی معلوم ہوتی ہے کیونکہ مستحق عذاب کسی ذریعہ سے مستحق مغفرت ہوجاتا ہے، لعنت کرنے والا شخص جس کے دل میں اس کی جانب سے کدورت ہے کہتا ہے کہ خدایا اس کو ہرگز نہ بخش اور کل ملائکہ اور انبیاء اور مومنین بھی دعا کریں تو سب کو رد کر دے، تو غضب الٰہی کو کیوں نہ جوش آئے! اگر مغفرت چاہنے والوں میں شریک ہونا اس بزرگوار کو

ناگوار تھا تو ساکت ہونا تھا۔ اس گستاخی کے کیا معنی کہ اپنی کدورت کا اثر خدا پر ڈالے کہ ارحم الرحمین اپنے متقضائے ذاتی کو چھوڑ کر تمام ملائکہ وانبیاء وصالحین کی دعا کو رد کر کے اس لعنت کرنے والے کی کدورت کی وجہ سے اس شخص کو رحمت سے بالکل محروم کر دے۔ کیا ایسا فضول شخص مستحق عذاب نہ ہوگا؟ عقلا بیشک ہونا چاہئے، کسی بادشاہ جلیل القدر کے روبرو اگر کوئی اس قسم کی گستاخی کرے اور کسی قسم کا ضرر اپنے مخالف کو پہونچانا چاہے تو وہ اس کا مستحق ہوگا کہ اسی قسم کا ضرر اس پر عائد ہو، اسی وجہ سے لعنت کرنے والے کی طرف اسی کی لعنت واپس آتی ہے اور وہ خود ملعون ہو جاتا ہے، لعنت کرنے والا چونکہ کمال غضب کی حالت میں ہوتا ہے اس لئے بے ساختہ لعنت کر دیتا ہے۔ اسی وجہ سے حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام فرماتے ہیں: ''**الغضب مفتاح کل شر**'' **کمافی کلینی** صفحہ(۵۲۳) یعنی غصہ تمام برائیوں کی کنجی ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا شر ہو کہ وہ خود اپنے آپ کو مستحق لعنت بناتا ہے۔

''تہذیب التہذیب'' میں لکھا ہے کہ حریز بن عثمان محدث حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر ہر روز صبح وشام، ستر ستر بار لعنت کرتے تھے۔ جب وجہ پوچھی گئی تو کہا کہ انہوں نے میرے باپ دادا کنبے کو قتل کر ڈالا۔ یہ غصہ کا اثر تھا کہ باوجود یہ کہ محدث ہیں اور فن حدیث میں ید طولی رکھتے ہیں مگر مغلوب الغضب ایسے کہ روزانہ ستر ستر بار ملعون ہونا قبول یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر لعنت ضرور کیں گے **نعوذ باللہ من ذلک و من المهالک** اسی طرح بعض سادات باوجود سنی ہونے کے صرف اس وجہ سے معاویہؓ پر

لعنت کرتے ہیں کہ اپنے جدامجد علی کرم اللہ وجہہ کی انہوں نے مخالفت کی تھی اگرچہ جواز لعنت پر بہت سے واقعات سے استدلال کرتے ہیں کہ وہ ظالم تھے اور ایسے تھے اور ویسے تھے مگر دراصل منشا اس کا غصہ اور تعصب وحمیت خاندانی ہے حالانکہ تعصب اہل بیت کرام کے نزدیک سخت مذموم ہے۔ چنانچہ کلینی صفحہ(۵۲۵) میں ہے:''**عن ابی عبداللہ علیه السلام من تعصب او تعصب له فقد خلع ربق الایمان عن عنقه**''یعنی جوشخص تعصب کرے سمجھ لو کہ ایمان اس سے نکل گیا۔لعنت کرنے والے حضرات کا بڑا استدلال اس پر ہے کہ معاویہؓ ظالم اور مسلمانوں کے قاتل تھے اور بعض بدعتیں انہوں نے ایجاد کیں اور ان اصناف کا ملعون ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہے مثلاً ﴿**لعنة اللہ علی الظالمین**﴾ وغیرہ مگر دیکھنا یہ چاہئے کہ ظلم وغیرہ کبائر جن کے مرتکب پر لعنت کا اطلاق ہوا ہے، آیا ان کی خاصیت یہ ہے کہ ان کا مرتکب قطعاً ملعون اور دوزخی ہوجاتا ہے اور مغفرت کی اسے امید ہی نہیں یا ایسا نہیں ہے؟۔آیات واحادیث سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ شرک کے سوا کسی گناہ میں یہ خاصیت نہیں کہ قطعاً دوزخی بنادے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے:﴿**ان اللہ لا یغفر ان یشرک به و یغفر ما دون ذلک لمن یشاء**﴾ یعنی خدائے تعالیٰ مشرک کو تو نہیں بخشتا اور اس کے سوا جس کو چاہے گا بخش دے گا۔اس سے ظاہر ہے کہ حقیقتہً ملعون فقط مشرک ہے اور کوئی مشرک لعنت سے بچ نہیں سکتا بشرطیکہ خاتمہ شرک پر ہوا ہو بخلاف دوسرے گناہوں کے کہ ان میں اس قسم کی تعمیم نہیں: مثلاً ظالم، کاذب وغیرہ کے بہت سے افراد ایسے بھی ہوں گے کہ بحسب آیت موصوفہ خود خدائے تعالیٰ انہیں

بخش دیگا۔ اور بہت سے اسباب مذکورہ بالا سے بخشے جائیں گے اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام امت مرحومہ معاذ اللہ معلون ہو جاتی کیونکہ یہ مسلم ہے کہ سوائے انبیاء کے کوئی معصوم نہیں اور حضرات شیعہ ائمہ کو بھی معصوم کہتے ہیں۔ بہر حال سوائے معصوموں کے جتنے مرتکبِ گناہ ہوں سب کا ملعون ہونا ثابت ہو جاتا اس سے ظاہر ہے کہ مرتکب کبائر پر جو لعنت وارد ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ خواہ مخواہ وہ ملعون سمجھا جائے۔ دیکھئے ﴿لعنت اللہ علی الکاذبین﴾ کا مطلب یہی ہے کہ جو کوئی خلاف واقعہ خبر دے وہ ملعون ہے مگر حضرات شیعہ علی کرم اللہ وجہہ اور ائمہ کرام کو ہرگز ملعون نہیں سمجھتے حالانکہ خلفاء ثلاثہ کی توصیف میں ان حضرات سے اکثر روایتیں وارد ہیں جن کو تقیہ پر محمول کرتے ہیں، جو دراصل خلاف واقعہ سمجھے جاتے ہیں اور جھوٹ کی حقیقت بھی یہی ہے، مگر اس جھوٹ کو موجب لعنت نہیں کہہ سکتے اسی طرح خضر علیہ السلام نے زبردستی سے کشتی توڑ دی اور بے گناہ لڑکے کو قتل کر ڈالا مگر یہ ظلم اور قتل موجب لعنت نہیں اور ﴿لعنت اللہ علی الظالمین﴾ کا وہ مصداق نہیں ہوسکتے، جیسا کہ قرآن شریف سے ثابت ہے اور نیز علی کرم اللہ وجہہ و دیگر صحابہ نے ہزار ہا مسلمانوں کو قتل کیا اور مسلمان باغی ہو جائیں تو ان کو قتل کرنے کا حکم ہے حالانکہ وہ بھی مومنین کا قصداً قتل ہے، جس کی وجہ سے بحسب آیۂ شریفہ ﴿و من یقتل مومنا معتمدا فجزاء ہ جہنم خالدا فیہا و غضب اللہ علیہ و لعنہ و اعدّلہ عذابا عظیما﴾ قاتل ملعون ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر قاتل و ظالم کو ملعون نہیں کہہ سکتے۔ اب یہ کس طرح پہچانا جائے کہ فلاں ظالم یا کاذب ملعون اور قابل لعنت ہے؟ یہ تو وہ

شخص جانے جس کو ہر ایک کی شقاوت وسعادت اخروی کا علم ہو، تا کہ خاص اسی پر لعنت کرے جس کا ملعون ہونا اس کو معلوم ہو، اور جس کو یہ علم نہ ہوتو کبھی تو اس کی لعنت ملعون حقیق پر پڑ جائیگی اور کبھی ایسے شخص پر جو علم الٰہی میں ملعون نہیں ہے۔ اور جب ایسے شخص کی طرف جائے گی جو فی الواقع ملعون نہ ہوتو بحسب احادیث متفقہ سنی وشیعہ وہ لعنت کرنے والے ہی کی طرف لوٹے گی جس سے وہ خود ملعون ہو جائیگا۔

کلینی کی روایت اس باب میں ابھی مذکور ہوئی اور ترمذی وابوداؤد میں ابن عباسؓ سے روایت ہے ''**قال رسول ﷺ من لعن شیئالیس له باهل رجعت اللعنة علیه کذا فی المشکوة**'' یعنی جو شخص کسی پر لعنت کرے اور وہ اس کا اہل نہ ہوتو لعنت اسی شخص پر لوٹتی ہے جس نے لعنت کی۔ غصہ کی حالت میں جب اپنے مخالف کا خیال یاذکر آتا ہے تو آدمی اپنے دل کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے اس پر لعنت کر کے یہ سمجھتا ہے کہ میں نے اس پر ایک ایسا پرلے درجہ کا وار کیا کہ وہ سنبھلنے نہ پایا یا یوں کہئے کہ اس کو قتل کر ڈالا یعنی اس کی آخرت خراب کی اگر یہ اندرونی خیال نہ ہوتو لعنت کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ غصہ کی حالت میں اموات پر لعنت کرنا یہ بتلاتا ہے کہ اگر وہ اس وقت سامنے ہوتا تو اس کو قتل ہی کر ڈالتا، گویا یہ کلمہ بجائے قتل کے ہے، خدائے تعالی ایسے خیالات ضرر رسانی کو کب جائز رکھتا ہے اس لئے اس کا وبال اسی پر لوٹتا ہے اگر لعنت کا لوٹنا محسوس اور اس عالم میں اس کا اثر نمایاں ہوتا تو بحسب حدیث شریف بے موقع لعنت کرنے والے پر آثار لعنت نمایا ہو جاتے اور دوسرے اس سے عبرت حاصل کر کے اس فعل شنیع سے بچتے۔ مگر افسوس ہے کہ

لعنت کا اثر اس عالم میں نمایاں نہیں ہوتا کیونکہ لعنت اس رحمت الٰہی سے دور ہونے کا نام ہے جو آخرت میں ہونے والی ہے۔ اس لئے معلوم نہیں ہوسکتا کہ لعنت جس پر کی گئی اسی پر پڑی یا لعنت کرنے والے پر لوٹ آئی جس کا اثر قیامت میں ظاہر ہوگا کہ یہ لعنت کرنے والا رحمت الٰہی سے دور ہو جائیگا۔ اب ان احادیث پر ایمان لانے والے کا فرض ہے کہ ایسے شخص پر لعنت کرے جس کا ملعونِ ازلی ہونا قطعی طور پر معلوم کرلیا ہوتا کہ لعنت کو واپس ہونے کا موقع نہ ملے اور غلط فہمی سے ﴿لعنت اللہ علی الظالمین﴾ وغیرہ کا مطلب یہ نہ سمجھ لے کہ جس نے جھوٹ کہا یا ظلم کیا وہ ازلی اور قطعی ملعون ہے کیونکہ ابھی معلوم ہوا کہ ان آیات کا مصداق عام نہیں یعنی ہر ظالم ملعون نہیں۔ ہاں اگر قرآن و حدیث میں کسی خاص پر لعنت ہوتو ہم بھی بیشک اس پر لعنت کر سکتے ہیں مگر یہ یاد رہے کہ جن صحابہ پر لعنت کی جاتی ہے نہ قرآن میں ان پر لعنت وارد ہے نہ صحیح حدیث میں بلکہ قراان شریف میں ہر مسلمان کا فرض بتایا گیا ہے کہ ہر گذشتہ مسلمان کے حق میں دعائے مغفرت کیا کریں چنانچہ ارشاد ہے: ﴿و الذین جاء و امن بعد ھم یقولون ربنا اغفرلنا و لاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رء وف رحیم﴾ یعنی جو لوگ مہاجرین وانصار کے بعد آئے وہ کہتے ہیں کہ الٰہی ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ گذر گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو یہ دعا نہیں کرتے ان کے مسلمان ہونے میں کلام ہے ﴿والذین جاء وامن بعدھم﴾ ہر زمانے کے مسلمانوں پر صادق آ سکتا ہے اس لئے کہ سب ان کے بعد آئے

ہوئے ہیں اس صورت میں مقتضائے اخبار الٰہی یہی ہوگا کہ ہر زمانے کے مسلمان وہی ہوں گے جو صحابہ کے دعا گو ہیں۔ ورنہ اخبار الٰہی کا خلاف واقع ہونا لازم آئیگا جو محال ہے۔ ﴿**والذین جاء وامن بعدھم**﴾ سے مراد صحابہ کے بعد کے لوگ ہیں اس وجہ سے کہ صواعق محرمہ میں مسلم شریف سے یہ روایت منقول ہے کہ عائشہؓ فرماتی ہیں ''**امروا بان یستغفروا باصحاب محمد**ﷺ **فسبوھم**'' یعنی حکم تو یہ تھا کہ صحابہ کے لئے استغفار کریں اور ہو رہا ہے یہ کہ ان کو لوگ گالیاں دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ گالیاں دینے والے صحابہ کے بعد کے لوگ تھے یعنی خود صحابہ نہ تھے اور وہ اس آیت سے استغفار کرنے کے مامور ہیں۔ ابن تیمیہؒ نے منہاج السنۃ میں نقل کیا ہے کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اصحاب نبیﷺ کے لئے استغفار کیا کریں حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ آپس میں جنگ وجدال کریں گے۔ بہرحال کئی روایتوں سے ثابت ہے کہ یہ آیت شریفہ حکم کرتی ہے کہ بعد والے صحابہ کے حق میں دعائے مغفرت کیا کریں اور ان سے بغض وکینہ نہ رکھیں۔ اور اگر اس سے مراد وہ صحابہ ہیں جو مہاجرین وانصار کے بعد اس آیت شریفہ کے نزول تک اسلام میں داخل ہوئے ہیں تو جب بھی ان کا اتباع ضرور ہے کیونکہ جب انہوں نے ان آیات شریفہ کو سنا ہوگا: ﴿**للفقراء المھاجرین الذین اخرجوا من دیارھم**﴾ الخ جن میں مہاجرین وانصار کا خصوصیات کے ساتھ ذکر ہے کہ مہاجرین اپنے گھر بار سے نکالے گئے، اور خدائے تعالیٰ کا فضل اور رضامندی طلب کرتے ہیں، اور خدا اور رسول کی مدد کرتے ہیں اور انصار کے حالات یہ بیان کئے گئے کہ وہ

مہاجرین کو دوست رکھتے ہیں اور ایثار کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ان بعد والے اصحاب نے اپنا بھی ذکر ان آیتوں کے بعد سنا ہوگا کہ باوجود یہ کہ نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور جہاد وغیرہ عبدات روزمرہ سے متصف ہیں مگر ان سب میں سے یہی ایک صفت یاد فرمائی گئی کہ گذشتہ مسلمانوں کے دعا گو اور سچے دوست ہیں۔تو کہئے کہ کس قدر وہ اس صفت کے دلدادہ ہوئے ہوں گے اور کیسی عزت افزائی کا باعث اسے خیال کرتے ہوں گے؟ کیوں نہ ہو! قیامت تک ان کی اس صفت کا ذکر خدائے تعالی کے کلام میں پڑھا جائیگا، ممبروں پر واعظ اسی صفت جمیلہ کو ذکر کر کے مسلمانوں کو ترغیب دلاتے ہیں، نمازوں میں پڑھ کر اہل اسلام تقرب الی اللہ حاصل کرتے ہیں، غرض کہ ﴿والذین جاء وامن بعدھم ﴾ سے مراد اگر صحابہ ہی ہیں جو نزول آیت کے وقت موجود تھے، جب بھی یہ صفت تمام اہل اسلام کے نزدیک قابل قدر ہونی چاہئے۔

الحاصل قرآن شریف میں بجائے اس کے کسی صحابی پر لعنت کرنے کا حکم یا اجازت ہو ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر ان سے کوئی گناہ بھی صادر جائے تو بعد والے لوگ ان کی مغفرت کی دعا کیا کریں۔

معین شخص پر لعنت درست نہیں:

ہم نے جو لکھا کہ کسی معین شخص پر لعنت درست نہیں، اگرچہ موجب لعنت اس میں پایا جائے۔اس پر یہ بھی دلیل ہے کہ حق تعالیو فرماتا ہے: ﴿ان الذین یرمون المحصنات الغلافلات المؤمنات لعنوا فی الدنیا والاخرۃ ﴾یعنی جو لوگ

پاکدامن بیبیوں پر الزام زنا لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت ہے۔ اور احادیث سے ثابت ہے کہ حسان بن ثابت اور مسطح رضی اللہ عنہما نے عائشہ رضی اللہ عنہما پر معاذ اللہ یہ تہمت لگائی تھی، باوجود اس کے ان صاحبوں کو نہ کسی نے ملعون کہا، نہ کہنا جائز ہے۔ جب بروایات صحیحہء حضرات شیعہ لعنت کرنے والا بدترین خلائق اور مشرف علی الہلاک ہونا ثابت ہے۔ اور نیز احادیث صحیحہء فریقین سے مصرح ہے کہ "**لا یکون المؤمن لعانا. کما فی الترمذی وغیرهم**" اور بروایات فریقین لعنت کرنے والے کا معلون ہوجانا ثابت ہے تو اب ایسی کونسی ضرورت ہے کہ آدمی صحابہ پر لعنت کر کے بدترین خلائق اور بے ایمان اور ملعون بنے۔

مجوزین لعنت "**لایکون المؤمن لعانا**" معنی یہ بتلاتے ہیں کہ جو شخص مستحق لعنت نہ ہو اس پر مومن لعنت نہیں کرتا اور جو مستحق لعنت ہو اس پر لعنت کرنا چاہئے۔ اور معاویہؓ نے چونکہ فساد کیا، خدا اور رسول ﷺ کو ایذا دی، قطع رحم کیا، ظلم کیا، مسلمانوں کو قتل کیا، اور یہ ایسی صفات ہیں کہ جو کوئی ان کا مرتکب ہو بحسب آیات و احادیث ملعون ہے، اس لئے ان پر لعنت کرنا چاہئے۔ مطلب یہ کہ ﴿**لعنت الله علی الظالمین**﴾ کے لحاظ سے جس ظالم کو آدمی دیکھے اس پر لعنت کردے۔ اسی طرح جس پر عمومی لعنت وارد ہوئی ہے اس کے ہر فرد پر لعنت کیا کرے۔ اس استدلال میں ہمیں کلام ہے اس لئے کہ اقسام کے لوگوں پر عام طور پر لعنت قرآن و حدیث میں وارد ہے۔ چنانچہ سود لینے اور دینے والا اور اس کا لکھنے والا اور شاہد اور شرابی اور شراب بیچنے والا اور اس کا ممد اور معاون اور چور اور شطرنج

کھیلنے والا اور نوحہ کرنے والی عورتیں اور اس کا سننے والا اور مجلس کے حلقے کے وسط میں بیٹھنے والا اور وہ فقیر جو خدا کا واسطہ دے کر کچھ مانگے اور وہ شخص جو اس کو کچھ نہ دے اور خطبہ اور اشعار میں تکلف کر کے ان کو عمدہ اور دلچسپ بنانے والا اور وہ شخص جو روپیہ جمع کرے اور مسلمان کو کسی قسم کا ضرر پہنچانے والا اور جھوٹا وغیرہ جن پر قرآن وحدیث میں لعنت وارد ہے کثرت سے موجود ہیں۔اب اگر یہ بات ٹھیر جائے کہ جن میں یہ صفات پائے جائیں ان پر لعنت کرنا چاہئے۔تو صبح سے شام تک لعنت کرنے سے فرصت نہ ملے،اس لئے کہ شاید ہزاروں میں کوئی ایسا ہوگا جس میں کوئی صفت موجب لعنت نہ پائی جائے۔کیونکر سب معصوم نہیں پھر خود لعنت کرنے والے صاحب بھی تو معصوم نہیں ان پر بھی ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوگی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ابتداء تو لعنت سے ہوگی پھر دھول دھپہ جوتی پیزار، وہاں سے گشت وخون کی نوبت روزآنہ پہنچا کرے گی۔اور آیہء شریفہ﴿ولا تنازعوا فتفشلوا ﴾فقط تلاوت کیلئے رہ جائیگی۔اسی وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا ’’المؤمن لا یکون لعانا ‘‘اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ معصوموں پر لعنت نہ ہواور ان کے سوا سب پر فراغت سے لعنت کیا کریں،تو اس بدامنی کا مانع کون؟اگر کہا جائے کہ اتنی عام اجازت نہیں،فقط معاویہؓ اور ان کے رفقا پر لعنت کرنا چاہئے۔تو اس ترجیح بلا مرجح کے لئے دلیل کی ضرورت ہوگی حالانکہ کسی حدیث میں یہ بات دیکھی نہیں گئی کہ معاویہؓ یا باغیوں پر ہمیشہ لعنت کی جائے بلکہ بجائے لعنت کے یہ حکم مصرح ہے کہ کل مسلمانوں کے واسطے دعائے مغفرت کرنا چاہئے خواہ زندہ ہوں یا مردہ، اسی وجہ سے نمازوں اور خاص

خاص وقتوں میں عموماً مسلمان یہ کہتے ہیں﴿رب اغفر للمؤمنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات الاحیاء منهم والاموات ﴾یعنی اے رب تمام زندہ اور مردہ مسلمانوں کو بخش دے۔جن میں باغی لوگ بھی شریک ہیں کیونکہ مسلمانوں میں جو باغی ہوئے انکو حق تعالی نے مسلمانوں سے خارج نہیں کیا بلکہ ان کو بھی مومنین کے لقب سے یاد فرمایا کما قال تعالی﴿وان طائفتان من المؤمنین اقتتلوا فاصلحوا بینهما فان بغت احدٰهما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفیٔ الی امر الله ﴾یعنی اگر ایمانداروں میں سے دو جماعتیں باہم جنگیں کریں تو دونوں میں صلح کرادو پھر اگر ایک دوسرے پر بغاوت کرے تو باغیوں کے ساتھ جنگ کرو یہاں تک کہ خدائے تعالی کی طرف وہ رجوع کریں۔دیکھئے باغی لوگ ظالم بھی ہوتے ہیں اور مسلمانوں کو قتل بھی کرتے ہیں اور حدود الٰہی سے تجاوز بھی کرتے ہیں مثلاً نقض امن، بغض، عدوات، حسد، کینہ، تخویف مسلمین، استحلال اموال وانفس اہل اسلام، نہب وغارت وفساد فی الارض، لعن، سب وشتم، تکبر وغیرہ امور جوان سے سرزد ہوتے ہیں اور یہ ہر ایک امر ایسا ہے کہ اس کے مرتکب پر آیات واحادیث میں لعنت وارد ہے، باوجود اس کے کہ ان کو خدائے تعالی نے مومنین ہی فرمایا اور مومنین کی مغفرت کے لئے دعا کرنے کی ترغیب دی۔جس پر تمام مسلمان عمل پیرا ہیں۔اور حدیث صحیح میں وارد ہے جو مسلم اور ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان بھائی کے حق میں غائبانہ دعائے خیر کرے تو فرشتہ آمین کہکر یہ کہتا ہے کہ تیرے لئے بھی وہی ہے جو اس کے لئے تو نے دعا کی۔یعنی اگر

دعائے مغفرت کی تو اس دعا گو کے لئے بھی مغفرت ہوگی۔ اب کہئے کہ آیات واحادیث سے معاویہؓ کے حق میں دعائے خیر کرنیکی ترجیح ہے یا بد دعا کی؟ بلکہ اس حدیث صحیح سے تو اچھی طرح ثابت ہوتا ہے کہ اگر ان کا نام لیتے وقت دعا کریں کہ خدایا تو ان سے راضی ہو، اور ''رضی اللہ عنہ'' کہیں تو فرشتے ہمارے حق میں رضا مندیٔ الٰہی کی دعا کریں۔ بخلاف اس کے لعنت کرنے میں احتمال قوی ہے کہ لعنت رجوع کرے جس کا حال ابھی معلوم ہوا۔ جامع الصغیر میں طبرانی سے نقل کیا ہے: ''**قال رسول اللہ ﷺ لعن اللہ من سب اصحابی** ''اس سے تو معلوم ہوا کہ وہ لعنت چاہے رجوع کرے یا نہ کرے نفس فعل سے لعنت کرنے والا معلون ہوجاتا ہے، اس لئے حضرت نے اس میں کوئی شرط نہ لگائی بلکہ عموما صحابہ کو گالی دینے والے کی نسبت فرمایا۔ اب معاویہؓ جب تک صحابہ سے خارج نہ کئے جائیں ان کی نسبت بدگوئی درست نہیں ہوسکتی اور صحابہ سے ان کو خارج کرنا محال ہے۔ بعض سادات باوجود سنی ہونے کے حمیت نسبی کی وجہ سے ان پر لعنت کرتے ہیں اور وہ مجبور ہیں۔ بمقتضائے طبیعت آیات واحادیث کو کھینچ تان کر معاویہؓ پر منطبق کرتے ہیں۔ اور دوسری آیات واحادیث کو جو عدم جواز لعن میں وارد ہیں بالکل نظر انداز کردیتے ہیں۔ ان کی مثال بعینہ ایسی ہے جیسے حریز بن عثمان، علی کرم اللہ وجہہ پر ہر صبح وشام ستر بار لعنت کیا کرتے تھے، جب ان سے وجہ پوچھی گئی تو کہا کہ میرے آبا واجداد اور کنبے کو انھوں نے قتل کر ڈالا۔ ''تہذیب التہذیب'' میں لکھا ہے کہ اکابر محدثین نے گواہی دی ہے کہ شام کے محدثوں میں کوئی ان سے افضل نہ تھا۔ ابن معینؒ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے تمام اساتذہ سے

سنا ہے کہ ان کی توثیق کرتے تھے۔اس سے زیادہ کیا ہو کہ امام بخاری جیسے امام المحدثین نے ان کی روایتیں صحیح بخاری میں لکھی ہیں، امام احمدؒ جیسے محبّ اہل بیت جن کی عقیدت کا حال کسی قدر ہم نے ’’حقیقۃ الفقہ‘‘ میں لکھا ہے وہ ان کی نسبت فرماتے ہیں ’’ثقۃ ثقۃ‘‘ غرضکہ اکابرین دین کی تحقیق سے ثابت ہے کہ دین کے کسی معاملہ میں ان پر کسی قسم کا الزام عائد نہ تھا، جتنے امور تدین کے محدث کو چاہئے سب ان میں موجود تھے مگر ایک یہی بات تھی کہ علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت بدگوئی کرتے تھے، جس کی وجہ بھی بیان کر دی گئی۔ چونکہ غم و غصہ ایک ایسی چیز ہے کہ آدمی کو حد جنون تک پہنچا دیتا ہے اس لئے محدثین نے ان کو خاص اس مسئلہ میں مرفوع القلم سمجھ لیا تھا۔اسی طرح سنی سادات جو معاویہؓ پر لعنت کرتے ہیں وہ بھی اس غصہ کا مقتضی ہے۔

رہا آیات و احادیث سے استدلال جریز بھی اپنے بچاؤ کے لئے ان آیات و احادیث سے استدلال کرتے ہوں گے جس سے خوارج حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے معاذ اللہ کفر پر استدلال کرتے ہیں جو کتب خوارج اور ’’منہاج السنہ‘‘ میں مذکور ہیں۔ گو نقل کفر کفر نباشد، مگر اس نقل کو بھی ہم ہرگز مناسب نہیں سمجھتے۔ بہرحال تعصب کی حالت میں جو استدلال کئے جاتے ہیں وہ ہرگز قابل اعتبار نہیں۔تعصب کا پردہ جب آنکھوں پر پڑ جاتا ہے تو حق بات کبھی نہیں سوجھتی، اسی وجہ سے اہل سنت والجماعت نے تعصب کو ایکطرف رکھ کر جس قدر آیات و احادیث اس باب سے متعلق ہیں ان کو پیش نظر رکھا اور اجتہاد کر کے فیصلہ کر دیا کہ معاویہؓ وغیرہ صحابہ پر زبان لعن وطعن نہ کھولی جائے اور یہ بھی تصریح کر دی کہ

صحابہ کے باہمی جنگ و جدال کتب تواریخ میں نہ دیکھے جائیں، اس لئے کہ مقتضی اکثر طبائع کا یہ ہیکہ ایک آدھ بات دیکھ کر فیصلہ کر دیتے ہیں اور شدہ شدہ تعصب کی نوبت پہنچ جاتی ہے، حالانکہ فیصلہ کرنا مجتہد کا کام ہے جس کی دشواریاں ''حقیقۃ الفقہ'' میں ہم نے بیان کی ہیں۔

ابن تیمیہؒ نے ''منہاج السنہ'' کی جلد اول صفحہ (۱۵۳) میں لکھا ہے کہ بخاری اور مسلم میں ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**لا تسبوا اصحابی فلو ان احدکم انفق مثل احد ذھبا ما بلغ مد احدھم و لا نصیفه**'' یعنی میرے اصحاب کو گالی نہ دو اگر کوئی مسلمان جبل احد کے برابر سونا خرچ کرے تو اس کا ثواب اس ایک مد یا نصف مد کے برابر نہیں ہوسکتا جو صحابہ نے خرچ کیا انتھی۔

مد اور نصف مد سے مراد غلہ ہے اس لئے کہ سونا مد کے حساب سے نہیں خرچ کیا جاتا، کیونکہ مد ایک چھوٹا پیمانہ ہے۔ مطلب یہ کہ آدھ سیر یا پاؤ سیر جو یا گیہوں صحابہ نے جو خرچ کیا اس کا اتنا ثواب ہے کہ اگر جبل احد کے برابر سونا کوئی خرچ کرے تو بھی اس کے برابر نہیں ہوسکتا اور ''منہاج السنہ'' میں مسلم شریف سے بروایت ابوہریرہؓ یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**لا تسبوا اصحابی فو الذی نفسی بیده لو ان احدکم انفق مثل احد ذھبا مابلغ مد احدھم و لا نصفیه**''۔ اس حدیث میں تو آپ نے قسم کھا کر فرمایا کہ عام مسلمانوں کا احد برابر سونا خرچ کرنا صحابہ کے آدھ سیر یا پاؤ سیر غلہ خرچ کرنے کے برابر نہیں۔ اب کہئے کہ ان صحیح حدیثوں سے جب عموماً صحابہ کو

گالیاں دینے کی ممانعت ثابت ہوگئی تو ''لعنت اللہ علی الظالمین'' کے لحاظ سے صحابہ پر لعنت کیونکر جائز ہوگی۔ جب آنحضرت ﷺ نے سبِ صحابہ سے منع فرمایا تھا تو اس وقت اس قسم کے تمام آیات پیش نظر تھے جن کو تمام خصاّر جانتے تھے مگر کسی نے یہ نہ کہا کہ حضرت ان عام لعنتوں کے باب میں جو آیات واحادیث وارد ہیں ان میں صحابہ اور غیر صحابہ سب شریک ہیں، پھر ان پر لعنت کرنے سے کون چیز مانع ہے؟ کیا ممکن تھا کہ کوئی شخص آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مقابلہ میں یہ معارضہ پیش کرسکتا؟ ہر گز نہیں۔ شارع علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا اس میں چوں وچرا کی گنجائش نہیں۔ اس سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ ''الظالمین'' سے مراد کل ظالم نہیں۔ اس پر قرینہ یہ آیۂ شریفہ ہے ﴿والذین جاء وامن بعد ھم یقولون ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا﴾ اس میں صحابہ کے حق میں دعا کرنے کا حکم ہے حالانکہ حق تعالیٰ جانتا تھا کہ ایک بڑی جماعت باغی ہوجائے گی اور ان سے گناہ صادر ہوں گے۔ اس سے ثابت ہے کہ صحابہ کے باب میں ان عمومی آیات سے قطع نظر کرکے ان کے حق میں دعا کیا کریں۔

''منہاج السنہ'' صفحہ (۱۵۳) میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیۂ شریفہ یعنی ﴿والذین جاء وامن بعدھم﴾ کے لحاظ سے وہ اچھے لوگ ہیں جو صحابہ کے حق میں استغفار کیا کرتے ہیں۔ اور صحیح مسلم کی حدیث نقل کی ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا کہ لوگ اصحاب رسول اللہ ﷺ کے حق میں بدگوئی کیا کرتے ہیں، فرمایا: یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، صحابہ کا عمل منقطع ہوگیا اس لئے خدائے تعالی نے چاہا کہ ان کا اجر منقطع نہ ہو۔

انتہی ۔

مطلب یہ کہ جو لوگ ان کے حق میں بدگوئی اور لعنت کیا کرتے ہیں، ان کی نیکیاں صحابہ کو دی جائیں گی، اور یہ قیامت تک جاری رہے گا۔ عائشہؓ نے ایک گُر کی بات بتائی کہ صحابہ چونکہ مقبولانِ بارگاہ رب العزت تھے اس لئے خدائے تعالیٰ کو منظور تھا کہ قیامت تک ان کے ثواب میں ترقی ہوتی رہے۔ چونکہ انتقال کی وجہ سے ان کے اعمال جن پر ثواب کا مدار ہے، منقطع ہو گئے، اس لئے اس کی یہ تدبیر کی گئی کہ بلحاظ آیت ﴿**والذین جاء و امن بعد هم**﴾ مسلمان لوگ ان کے حق میں دعائے خیر کیا کریں جس سے ترقی مدارج وقتاً فوقتاً ہوتی رہے اور جو لوگ اس آیت پر عمل نہ کرکے ان کی غیبت اور ان پر لعنت کیا کرتے ہیں ان کے اعمال ان حضرات کو ملا کریں۔ غرض کہ ہر طرح سے قیامت تک ان کے ثواب میں ترقی ہوتی رہے گی۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿**لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح و قاتل اولئک اعظم درجة من الذین انفقوا من بعد و قاتلوا و کلا و عدالله الحسنیٰ**﴾ یعنی تم مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے راہ خدا میں مال حرچ کیا اور لڑے وہ دوسرے مسلمانوں کے برابر نہیں ہوسکتے، درجہ میں اُن مسلمانوں سے وہ بڑھ کر ہیں جنہوں نے بعد کو مال خرچ کیا اور لڑے، اور اللہ تعالیٰ نے سب سے وعدہ جنت کا کیا ہے۔

دیکھئے اس آیت شریفہ میں صاف اور صریح ارشاد ہے کہ کل صحابہ سے جنت کا وعدہ وہ چکا ہے جس کا خلاف ممکن نہیں۔ ایسے لوگوں کی نسبت اگر کہا جائے کہ وہ ملعون یعنی رحمت

الٰہی سے دور ہیں تو کیا یہ بات سچی ہوسکتی ہے یا یہ کہنا درست ہوگا کہ الٰہی ان کو اپنی رحمت سے دور کر۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ یہ دعا سن لی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس آیت شریفہ میں جو وعدہ فرمایا گیا اس کا ایفا نہ ہوگا۔ حالانکہ ہر فرقہ کا مسلم امر ہے کہ **تخلف فی الوعد** جائز نہیں۔ تعجب نہیں کہ اس دعا کا الٹا اثر ہو، کیونکہ جب عام مسلمانوں پر لعنت کرنے سے رجوع لعنت کا احتمال ہے تو یہاں رجوع کا یقین ہونا چاہئے۔ کیونکہ باوجود خدائے تعالیٰ کے وعدے کے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ الٰہی ان سے وعدہ خلافی کر۔ اصل بات یہ ہے کہ صحابہ کو خدائے تعالیٰ نے برگزیدہ کر کے آنحضرت ﷺ کی مصاجت کا شرف عطا فرما۔ پھر ایسے برگزیدہ لوگوں کی بدخواہی اور ان پر لعنت کرنا کیوں کر درست ہوگا۔ یہ امر شاہد ہے کہ جس پر بادشاہ کی عنایت ہوتی ہے اس کے سب ہوا خواہ ہو جاتے ہیں اور اگر اس کو کوئی گالی دے تو وہ مستوجب سزا سمجھا جاتا ہے۔ یہ شرف جو ان حضرات کو حاصل ہے صرف اسی وجہ سے کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو اپنی مصاحبت میں اختیار فرمایا تھا۔ ورنہ وہی ابولہب اور ابوجہل بڑے بڑے درجہ کے لوگ مانے جاتے تھے، اور آنحضرت ﷺ کے ہم جدّ ہونے کا افتخار بھی ان کو حاصل تھا مگر ان سے کوئی مسلمان محبت نہیں رکھ سکتا۔

کنزل العمال میں کی روایتیں ہیں کہ جن میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے ’’**احفظونی فی اصحابی** ‘‘یعنی میرے اصحاب کے معاملہ میں مجھے نہ بھولنا۔ مطلب یہ کہ جب ان کا خیال کیا جائے تو آنحضرت ﷺ کی عظمت پیش نظر رہے تا کہ آپ کی وجہ

سے ان کی بزرگی اور فضیلت سمجھی جائے۔ اور مشکوۃ شریف میں روایت ہے کہ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ''**من احبهم فبحبّی احبهم و من ابغضهم فببغضی ابغضهم** ''یعنی صحابہ کے ساتھ محبت یا بغض رکھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت یا بغض رکھنا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے﴿**قل لا اسئلکم علیه اجرا الاالمودة فی القربی**﴾ یعنی آپ کہئے کہ میں تم لوگوں سے کسی قسم کا اجر نہیں چاہتا، صرف یہی درخواست کرتا ہوں کہ میرے قرابتداروں سے مودۃ اور دوستی رکھو۔ تفسیر ابن جریر وغیرہ میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ قبیلہ قریش میں کوئی شاخ ایسی نہ تھی جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرابت نہ ہو۔ اس لحاظ سے جتنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار صحابہ تھے، سب سے محبت رکھنے کی ضرورت ہے خواہ بنی ہاشم ہو یا بنی امیہ وغیرہ، البتہ مدارج میں فرق ہے، بیشک اہل بیت کرام سے زیادہ محبت کی ضرورت ہے۔ مگر اس سے لازم نہیں آسکتا کہ اوروں سے بغض رکھا جائے بلکہ بغض رکھنے کی صورت میں اس آیت شریفہ کی مخالفت لازم آجائیگی۔

کنز العمال میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدائے تعالی نے مجھے برگزیدہ فرمایا، اور میرے لئے صحابہ کو برگزیدہ کیا اور ان میں سے میرے وزیر اور اصہار مقرر فرمائے، سو جو شخص ان کو گالی دے اس پر اللہ اور ملائکہ اور تمام آدمیوں کی لعنت ہے، قیامت کے روز نہ اس کے فرائض قبول کئے جائں ی گے نہ نوافل۔ ''منتھی الارب'' میں لکھا ہے کہ اصہار داماد و پدر زن و برادر زن و دیگر اہل بیت زن۔ دیکھئے معاویہؓ علاوہ اس کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی قرابت قریبہ رکھتے تھے حضرت کے سالے بھی تھے، پھر ان پر

لعنت کرنا کیوں کر جائز ہوگا۔اس مضمون کی اور بھی روایتیں کنزالعمال میں موجود ہیں۔رہا یہ کہ ان حضرات میں باہمی کچھ شکررنجیاں واقع ہوگئی تھیں،تو وہ دوسری بات ہے۔اگران کے ساتھ محبت ہے تو صحابی ہونے کی حیثیت سے نہ معاذ اللہ اس وجہ سے کہ علی کرم اللہ وجہہ کے وہ مخالف تھے۔آنحضرت ﷺ نے بھی یہی فرمایا کہ صحابی ہونے کی وجہ سے محبت ہونا چاہئے۔جیسا کہ کنزالعمال میں ہے''**اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذو ھم غرضاً بعدی فمن احبھم فبحبی احبھم و من ابغضھم فببغضی ابغضھم** ''یعنی صحابہ کے بارے میں خدا سے ڈرتے رہو،میرے بعد ان کو نشانۂ ملامت نہ بناؤ،جس نے ان سے محبت رکھا اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت رکھا،اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھنے کی وجہ سے ان سے بغض رکھا انتہی۔

اللہ اکبر! کیسی سخت بات ہے کہ ان سے بغض رکھنا آنحضرت ﷺ سے بغض رکھنا ہے۔اب کہئے کہ مسلمان کیا کریں،سید صاحب کی بات سن کر ان حضرات سے بغض رکھ کر ملعون بنیں،یا آنحضرت ﷺ کے ارشاد پر عمل کر کے ان کی صحابیت کی وجہ سے ان سے بغض کو دور کریں،ہم تو یہی کہیں گے۔سید صاحب کو ضرور ہے کہ اگر خاندانی لحاظ سے بغض ہو بھی تو دعا کریں کہ خدائے تعالی اس بغض کو دور کرے،جس سے اس آیت شریفہ پر بھی عمل ہوجائے قولہ تعالی: ﴿**والذین جاء وامن بعدھم یقو لون ربنا اغفرلنا و لاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلو بنا غلا للذین اٰمنوا**﴾ اس آیت شریفہ میں اس امر کی پشنگوئی ہے کہ صحابہ میں ایسے واقعات پیش آئیں گے کہ ان کا

اثر مدتوں جاری رہے گا، اور بمقتضائے بشریت ایک جماعت دوسری جماعت سے بغض و عداوت رکھے گی۔ اور چونکہ یہ عداوت ان کے حق میں مضر ہے، اور حق تعالی بہ طفیل اپنے حبیب کریم ﷺ اس امت مرحومہ پر کمال درجہ مہربان ہے اس لئے یہ دعا تعلیم کی گی کہ ان حضرات کا کینہ ہمارے دل میں آنے ہی نہ پائے، تاکہ اس کا برا انجام ہمں ی بھگتنا نہ پڑے۔ اس پر بھی اگر ہم کینہ رکھیں اور اس کے دفع ہونے کی خواہش بھی نہ کری ں تو کس درجہ خلاف مرضی الٰہی ہوگا۔

''منہاج السنۃ'' صفحہ (۱۵۴) میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ اصحاب محمد ﷺ کو گالی نہ دو، اس لئے کہ ان کی ایک ساعت جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گذرتی تھی تمہارے چالیس سال کے عمل سے بہتر ہے۔ انتہی۔ مطلب یہ کہ ترقی مدارج، قرب الٰہی عبدات سے متعلق ہے مگر آنحضرت ﷺ کے فیضان صحبت سے ایک ساعت میں وہ ترقی مدارج ہوتی تھی کہ اوروں کو چالیس برس کی عبادت میں نصیب نہ ہو۔ اسی وجہ سے متعدد حدیثوں میں وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''طوبی لمن رانی'' پھر کیونکر جائز ہے کہ جن حضرات کا تقرب الٰہی اس درجہ کا ہو ان کی توہین کی جائے۔

کنز العمال میں روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے مَرے ہوؤں کو گالی نہ دو، اس لئے کہ ان کو گالی دینا حلال نہیں ہے۔ دیکھئے اس میں کوئی تخصیص نہیں، بلکہ عام اموات کو گالی دینا جائز نہیں چہ جائیکہ، صحابہ۔ اور اسی میں یہ روایت بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کسی کافر کو گالی دے کر مسلمان کو ایذا مت دو انتہی۔ غور کیجئے کہ کافر کو گالی

دینے سے مسلمانوں کوایذا ہوتواس کوگالی دینادرست نہیں۔ پھرصحابہ کوگالیاں دیکرایک بری جماعت اہل سنت کوایذا دینا کیونکر جائز ہوگا۔ اورایک روایت میں ہے کہ مردوں کوگالی دے کر زندوں کو ایذا مت دو۔ مجوزین لعنت شخصی کا بڑا استدلال اس پر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ابوسفیان وغیرہ پراورعلی کرم اللہ وجہہ نے معاویہؓ پرلعنت کی ہے۔اس کا جواب یہ کہ آنحضرت ﷺ کا ان حضرات پرلعنت کرنا توعین رحمت تھا۔ چنانچہ کنزل العمال میں کئی روایتیں اس مضمون کی مذکور ہیں: مسلم شریف کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ میں نے خدائے تعالی سے معاہدہ کرلیاہے کہ جس مسلمان پر میں لعنت کروں یا گالی دوں تو وہ اس کے حق میں زکوۃ اوراجر ہوجائے۔اورایک روایت میں ہے کہ الٰہی اگر میں کسی امتی کوگالی دوں یالعنت کروں تواس کے حق میں وہ صلوٰۃ وزکوۃ وقربت پاوے جس کی وجہ سے وہ قیامت کے روز تیراتقرب حاصل کرےاورایک روایت میں ہے کہ الٰہی جس امتی کومیں گالی دوں اس کے لئے تو کفارہ گناہ اوراجر بنادے۔اور ایک روایت میں ہے کہ الٰہی جس امتی پرمیں بددعایالعنت کروں تواس کواس کےحق میں برکت،مغفرت،رحمت اورطہور بنادے۔ان کے سوااورکئی روایتیں کنزل العمال میں مذکور ہیں جن سے ظاہر ہے کہ وہ لعنت معمولی نہیں جوممنوع ہوبلکہ وہ رحمۃ للعالمین کی رحمت ہے جس کا نتیجہ رحمت،مغفرت گناہ،اجراورتقرب الٰہی ہے۔ایسی لعنت تواوروں کے ہزار بار ’’رحمۃ اللہ علیہ‘‘ کہنے سے بہتر ہے۔اب اگرکسی کی لعنت اس قسم کی ہوتوشوق سے لعنت کیا کرےمگرچہ نسبت خاک رابا عالم پاک۔

رہا علی کرم اللہ وجہہ کا لعنت کرنا سو ممکن ہے کہ آپ نے بھی باتباع نبوی اس لفظ کو کم از کم دعائے مغفرت میں استعمال فرمایا ہو۔ ورنہ ان روایتوں میں ہمیں کلام ہے۔ اس لئے کہ قرآن وحدیث اور خود علی کرم اللہ وجہہ کے اقوال سے ثابت ہے کہ اگر کوئی کسی پر ظلم کرے تو بہتر ہے کہ مظلوم اس کو معاف کردے۔ حق تعالیٰ متقین کی صفت میں فرماتا ہے: ﴿والکاظمین الغیظ و العافین عن الناس واللہ یحب المحسنین﴾ یعنی وہ غصہ کھانے والے اور لوگوں کے قصور معاف کرنے والے ہیں اور اللہ دوست رکھتا ہے احسان کرنے والوں کو۔ دیکھئے غصہ کو کھانے اور ظالم کے قصور معاف کرنے کی کیسی فضیلت ہے کہ آدمی خدائے تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے۔ اب کہئے کون مسلمان ایسا ہوگا جو اللہ تعالیٰ کا محبوب بننا نہ چاہے مگر کمبخت نفس اس دولت عظمیٰ سے آدمی کو محروم کردیتا ہے۔ کیونکہ اس کی طینت میں تعلّی رکھی ہے، جب تک بدلہ لیکر اپنی تعلّی ثابت نہیں کردیتا اس کو تسکین نہیں ہوتی اور اگر بدلہ لینے کی قدرت نہ ہو تو گالیاں دینے اور لعنت کرنے لگتا ہے جس سے کسی قدر تسکین ہوتی ہے۔ غرضکہ مغلوبیت کی حالت میں بھی اپنی تعلّی کو نہیں چھوڑتا۔ مگر نفوس قدسیہ ایسے نہیں ہوتے، وہ ہمیشہ رضائے الٰہی کو پیش نظر رکھتے ہیں، ذاتی تعلّی ان سے جاتی رہتی ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ ان کی توصیف میں فرماتا ہے ﴿اذلۃ علی المؤمنین﴾ اب کیونکر تصدیق کی جائے کہ علی کرم اللہ وجہہ کا نفس بھی ایسا ہی تعلّی پسند اور خود سر تھا کہ لعنت کرنے ہی میں اس کو تسکین ہوتی تھی اور باوجودیکہ خدائے تعالیٰ نے ترغیب دی ہے کہ عفو کرنے والے محبوب خدا ہو جاتے ہیں مگر ان سے عفو کرنا نہ ہوسکا؟ حق تعالیٰ فرماتا ہے

﴿خذ العفو﴾ یعنی عفو کرو جس کا مطلب یہ ہے کہ اپنا حق کسی پر ثابت بھی ہو تو بغیر اس کے اس کا بدلہ لیا جائے ساقط کر دو۔ چونکہ یہ امر خلاف مقتضائے نفس ہے اس لئے حکم ہوا کہ اس صفت کو حاصل کرو۔ اگر چہ بظاہر یہ حکم خاص آنحضرت ﷺ کو ہے مگر قرآن شریف میں کئی جگہ خطاب خاص اور مراد عام ہوتی ہے: جیسے ﴿و لا تقل لهما اف﴾ میں ہے۔ اس لحاظ سے ہر امتی بحسب مناسبت اس کا مامور ہوگا، ادنی درجہ کے لوگوں کے لئے یہ امر استحبابی ہوگا کیونکہ عفو ہر کسی سے ہونا مشکل ہے۔ اگر وہ فرض ہو جاتا تو تقریباً تکلیف مالا یطاق ہوتی۔ بخلاف نفوس قدسیہ کے کہ وہ ہر امر الٰہی کے امتثال کو ضروری سمجھتے ہیں، خصوصا ان امور میں جو نفس پر زیادہ شاق ہوں، کیونکہ ان حضرات کو تو ہر طرح نفس کشی مقصود ہوتی ہے۔ اس میں سوائے خوارج کے کوئی شک نہیں کر سکتا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نفس مبارک قدسی تھا، اس لئے ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے اپنے مخالفین کے قصور کو ضرور معاف کر دیا تھا۔ اور ہر گز آپ کے نفس کے شایان نہ تھا کہ ان پر لعنت کر کے تسکین حاصل کرے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ان تعفوا اقرب للتقویٰ﴾ یعنی عفو کرنا تقوی سے قریب تر ہے۔ اب کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ معاذ اللہ متقی نہ تھے؟ پھر یہ کیونکر خیال جائے کہ آپ میں یہ صفت نہ تھی یا چھوٹے چھوٹے قصور معاف کیا کرتے تھے اور بڑے قصوروں کا معاف کرنا آپ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ حالانکہ کمال اس میں ہے کہ بڑے قصور معاف کئے جائیں ورنہ چھوٹے چھوٹے قصور تو ہم لوگ بھی معاف کر دیا کرتے ہیں۔ غرضکہ ان قرائن کو دیکھنے کے بعد ہر گز یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے مخالفوں کے قصور

معاف نہیں کئے تھے۔ دیکھئے آپ کا ارشاد ہے: ''بغوا علینا اخواننا'' کیسا پیار کا کلمہ ہے! جس سے محبت اور دلسوزی ٹپک رہی ہے، کس پیار سے آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے بھائیوں نے ہم پر بغاوت کی۔ قربان اس شریں کلامی کے کہ جانی دشمنوں کو بھی یاد کیا تو بھائی کہہ کر اور کس موقع میں کہ ان کی بغاوت کا بیان کرنا مقصود تھا۔ عام طبیعتوں کا مذاق گواہی دیتا ہے کہ اس موقع میں ''بغوا علینا الاشقیاء'' فرماتے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ آپ اس ملک کے نہ تھے جہاں ''برادر حقیقی دشمن تحقیقی'' کہا جاتا ہے بلکہ وہاں بھائی اولاد سے بھی زیادہ عزیز سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ نے مہاجرین و انصار میں اخوت قائم کی، تا کہ سب عزیزوں سے زیادہ ان میں باہمی محبت پیدا ہو۔ چنانچہ انہوں نے عملی طور پر اس اخوت کا یہ ثبوت دیا کہ اپنے مال میں ان کو شریک کیا اور اپنی بیبیوں کو طلاق دے کر ان کے نکاح میں دینے پر آمادہ ہوگئے۔ اس وقت بھائی اس عزت اور محبت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے کہ ان پر اپنی جان قربان کرتے۔ اور حق تعالیٰ نے جہاں صحابہ کی باہمی محبت کا ذکر فرمایا اس کو اس پیرایہ میں فرمایا ﴿واذکروا نعمت الله علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا﴾، یعنی اللہ کا وہ احسان یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی اور تم میں اس کے فضل سے باہمی ایسی محبت ہوگئی کہ ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہوگئے۔ اب غور کیجئے کہ جب آپ کے دل میں مخالفین کی اس قدر محبت تھی تو کیوں کر ہوسکتا تھا کہ عوام الناس کی طرح ''بغوا علینا الاشقیاء'' فرماتے۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿فمن عفا و اصلح فاجره على الله﴾ یعنی جس نے معاف کیا اور صلح کی تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کو تعلیم ہوئی کہ آپ یہ فرمادیں: ﴿ما اسئلكم عليه من اجر ان أجرى الا على الله﴾ یعنی میں تمہاری ہدایت میں جو اس قدر کوشش کرتا ہوں اس کا اجر تم سے کچھ نہیں مانگتا، میرا اجر اللہ ہی پر ہے۔ غور کیجئے کہ جو اجر اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ کس قدر قابل قدر ہوگا۔ پھر جس طرح نبی ﷺ کا اجر حق تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا ہے اسی طرح عفو کرنے والوں کا بھی اپنے ذمہ لیا ہے۔ اب کہئے کہ علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت یہ خیال ہوسکتا ہے کہ آپ ایسے اجر عظیم سے دست بردار ہوگئے ہوں گے؟ تو یہی کہیں گے کہ جس طرح نبی ﷺ اس اجر عظیم کے مستحق ہیں جس کا وعدہ حق تعالیٰ نے آپ سے فرمایا، علی کرم اللہ وجہہ بھی عفو کرکے اس اجر عظیم کے ضرور طالب اور مستحق ہوں گے اور یہ ممکن نہیں کہ عفو کرنے کے بعد بھی آپ نے لعنت کی ہو، اس لئے کہ جب کسی کا قصور معاف کردیا جاتا ہے تو اس پر بددعا کرنے کا کوئی حق نہیں اس لئے کہ بددعا میں یہی ہوتا ہے کہ ہم اپنا حق ظالم سے نہیں لے سکے اس لئے خدا اس کا معاوضہ اس سے لے، پھر جب اپنا حق ہی معاف کردیا تو خدا کو اس کا معاوضہ لینے کی کیا ضرورت۔ ''احیاء العلوم'' می عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے ظالم کے حق میں بددعا کی اس نے اپنا بدلہ لے لیا۔ اب اگر فرض کیا جائے کہ آپ نے مخالفین کے حق میں لعنت اور بددعا کی، تو بدلہ لینا ثابت ہوجاتا ہے۔ اور اس سے لازم آئیگا کہ آپ عفو قصور کے فضائل حاصل نہ کرسکے۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے﴿لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول الامن ظلم و کان اللہ سمیعا بصیرا ○ ان تبدوا خیرا او تخفوہ او تعفوا عن سوء فان اللہ کان عفوا قدیرا﴾یعنی خدائے تعالیٰ پسند نہیں کرتا کہ کوئی کسی کو برا کہے، مگر جس پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ سمیع علیم ہے اگر تم لوگ نیکی ظاہر کرو یا چھپا کر یا کوئی تم میں سے برائی کرے تو تم اس کو معاف کر دو تو یہ اچھا ہے۔ اس لئے کہ اللہ عفو یعنی معاف کرنے والا اور قادر ہے۔ اس آیت شریفہ میں اگرچہ مظلوم کو اجازت دی گئی کہ ظالم کو برا بھلا کہے مگر ساتھ ہی معاف کرنے کی فصیلت بیان کی گئی اور اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ عفو ہماری صفت ہے۔ اب غور کیجئے کہ علی کرم اللہ وجہ نے مخالفوں پر لعنت کی ہوگی یا اس لحاظ سے کہ عفو خدا تعالی کی صفت ہے جس کی ترغیب اس آیت شریفہ میں دی گئی، معاف فرمایا ہوگا۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ آپ ان حضرات کے امام ہیں جو متخلق با خلاق اللہ ہیں یعنی اولیاء اللہ اس لئے ضرور اس صفت کے ساتھ متصف تھے اور رخصت پر عمل کر کے اس فضیلت کو ترک کر دینا ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔

احادیث در فضیلت عفو

عفو کرنے کے باب میں جو احادیث وارد ہیں وہ بکثرت ہیں۔ چند روایتیں ان میں سے یہاں کنزل العمال سے نقل کی جاتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عفو کرنے سے آدمی کی عزت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے تم عفو کیا کرو کہ خدائے تعالی تمہیں عزت دے گا۔

اور فرمایا کہ شب معراج میں نے جنت میں کئی محل ایسے دیکھے کہ مستوی اور دوسرے محلوں سے بلند ہیں۔ میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ یہ کن کے ہیں؟ کہا جو لوگ غصہ کو دور کرتے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں، ان کے لئے ہیں۔

اور فرمایا جس کو منظور ہو کہ جنت میں اس کے مکان اور درجات قیامت کے روز بلند ہوں تو چاہئے کہ جس نے ان پر ظلم کیا ہو اس کا قصور معاف کرے اور جس نے اسے محروم کیا ہو اس کو عطا کرے اور جس نے قطع رحمی کی اس کے ساتھ صلہ رحمی کرے اور جو جہالت سے پیش آئے اس کے ساتھ حلم کرے۔

ان روایتوں سے ثابت ہے کہ عفو اعلیٰ درجہ کا خلق ہے اور معلوم ہے کہ اخلاق حسنہ اور رفعت درجات اخروی میں تلازم ہے۔ جب ہمیں یقین ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ صحابہ میں بڑے درجہ کے صحابی ہیں تو ہمیں یقین کرنا چاہئے کہ عفو کی صفت بھی آپ میں اوروں سے بڑھی ہوئی ہوگی۔

کلینی صفحہ (۴۴۰) میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عین خطبہ میں فرمایا کہ دنیا اور آخرت میں بہترین خلائق وہ ہے کہ ظالم کا قصور معاف کردے اور قاطع رحم سے صلہ رحمی کرے اور برائی کرنے والے کے ساتھ احسان کرے اور جس نے اسے محروم کیا ہو اسے عطا کرے۔

اور اسی میں ابوعبداللہ علیہ السلام کا ارشاد منقول ہے کہ مکارم دنیا و آخرت سے یہ ہے کہ ظالم کا قصور معاف کرے۔ انتہی۔

ان کے سواء اور کئی روایتیں اس میں مذکور ہیں غرض کہ فریقین کی کتابیں فضیلت عفو کو حدیثوں سے بھری ہوئی ہیں۔ پھر کیا یہ ہوسکتا ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ جیسے جامع مکارم اخلاق اس خلق حسن کے ساھت متصف نہ ہوں؟ اب اگر فرض کیا جائے کہ آپ نے ان کو عفو تو کر دیا تھا مگر لعنت بھی کی، تو یہ نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ لعنت ایک سخت بد دعا ہے کہ خدائے تعالی ملعون کو اپنی رحمت سے دنیا، آخرت میں دور کر دیوے۔ اور ابھی معلوم ہوا کہ جس نے اپنے ظالم کے حق میں بد دعا کی، اس نے اپنا بدلہ لے لیا۔ پھر جب لعنت کر کے بدلہ لینا ثابت ہو جائے تو اس بدگمانی کی ضرورت ہوتی ہے کہ آپ نے معاذ اللہ قرآن پر عمل کیا نہ احادیث صیحہ پر، حالانکہ آپ سے کم درجہ کے لوگ اس صفت میں ممتاز تھے۔ چنانچہ ''احیاء'' میں ابراہیم تیمی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جب مجھ پر کوئی ظلم کرتا ہے تو بجائے اس کے کہ مجھے اس پر غصہ آوے رحم آتا ہے، اس خیال سے کہ ظلم کے بعد اس کے دل میں ضرور تشویش ہوئی ہوگی اور خدائے تعالیو جب قیامت کے دن اس سے سوال کرے گا تو وہ کیا جواب دے گا۔ اس سے ثابت ہے کہ بجائے لعنت یہ حضرات بمقتضائے رحم ظالم کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں، کیونکہ لعنت مقتضائے غضب ہے اور رحم کا متقضا دعائے خیر ہے۔ اب کہئے کہ جب اولیاء اللہ جو علی کرم اللہ وجہہ کے زلہ ربا ہیں ان میں یہ صفت ہو تو آپ میں کیونکر نہ ہوگی۔ غرض کہ یہ ہرگز قرین قیاس نہیں کہ آپ نے مخالفین پر لعنت کی ہو۔

اب اگر لعنت کی روایتیں صحیح مان لی جائیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا جو بادی

النظر میں سمجھا جاتا ہے۔اب یہ کہنا پڑے گا کہ اس سے مراد لعنت دنیوی ہے جس کے عرب قائل تھے،ان کی عادت تھی کہ جب بادشاہ کے دربار میں جاتے تو بطور تحیت ''ابیت اللعنة '' کہتے یعنی اے بادشاہ تونے اس بات سے انکار کردیا کہ کسی کو اپنے خیر سے ہانک دے۔کیونکہ لعنت کے معنی لسان العرب وغیرہ میں یہ لکھے ہیں کہ ''ھو الا بعاد والطرد من الخیر ''اور قرآن شریف سے بھی ثابت ہے کہ لعنت دو قسم پر ہے: دنیوی اور اخروی۔چنانچہ حق تعالی فرماتا ہے:﴿لعنوا فی الدنیا والاخرة ﴾یعنی دنیا میں بھی وہ لعنت کئے گئے اور آخرت میں بھی۔اگر لعنت ''مطلقاً طردعن الرحمة'' کا نام ہوتا تو اس آیت شریفہ میں ''فی الدنیا'' کا ذکر نہ ہوتا، دنیا کی لعنت سے مراد دنیوی شقاوت ہے کہ آدمی اپنی مرادات میں کامیاب نہ ہو اور مفلوک رہے اور آخرت کی لعنت عذاب ہے۔ جب علی کرم اللہ وجہہ نے دیکھا کہ مخالفین اپنے ارادوں میں کامیاب ہوتے جاتے ہیں تو دعا کی کہ الہ العالمین ان کو کامیابی اور سلطنت اور خیر دنیوی سے دور کردے، تاکہ خلافت حقہ کو صدمہ نہ پہنچا سکیں۔ادنی تامل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کے حق میں لعنت دنیوی یہی تھی کہ سلطنت نہ ملے اور اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہوں۔اگر غور سے دیکھا جائے تو مخالفین کے حق میں یہ دعائے خیر تھی کہ بغاوت کے گناہ سے محفوظ رہیں اور قیامت کے روز اپنے ہم چشموں میں شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔اہل ایمان جانتے ہیں کہ مسلمان کے حق میں دنیا کی شقاوت آخرت کی سعادت کا باعث ہے،اس وجہ سے اولیاء اللہ سعادت دنیوی اور ہر کام میں فائز المرام ہونے کو برا سمجھتے ہیں۔غرض کہ علی کرم اللہ وجہہ نے لعنت کے ضمن

میں اخوت کا پورا حق ادا فرمایا، جس کو اہل بصیرت بخوبی جانتے ہیں اور ’’بغوا علینا اخواننا‘‘ سے جو اظہار محبت کیا تھا اس لعنت میں بھی وہی ملحوظ رکھا۔ کیوں نہ ہو آنحضرت ﷺ کی لعنت بھی تو آخرت میں رحمت اور باعث تقرب الٰہی تھی۔ اگر علی کرم اللہ وجہہ نے بھی آنحضرت ﷺ کی پیروی کی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ آپ ہر بات میں آنحضرت ﷺ کے پورے پیرو اور قدم بقدم متبع تھے۔ اگر ہم بدگمانی سے کہیں کہ اس باب میں آپ نے اتباع نہیں کیا تو خوف ہے کہ بمصداق ﴿ان بعض الظن اثم﴾ گناہ گار ہو جائیں اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے روبرو شرمساری اٹھانی پڑی: شعر

کار پاکاں راقیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر شیر

انہیں حضرات کی شان میں وارد ہے۔ ناسخ التواریخ کی جلد سوم صفحہ (٦٧٨) میں ہے کہ جب ابن ملجم کو گرفتار کر کے حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے روبرو حاضر کیا گیا اور شور گریہ وزاری بلند ہوا تو اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا، حضرت امام حسن علیہ السلام نے عرض کی کہ دشمن خدا اور سول گرفتار کر کے لایا گیا ہے، آپ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا: ’’یا ھذا ‘‘یعنی اے شخص تو نے یہ برا کام کیا، کیا میں تیرے حق میں بُرا امام تھا؟ جس کا بدلہ تو نے یہ کیا۔ کیا میں تجھ پر مہربان نہ تھا؟ تیرے ساتھ میں اوروں سے زیادہ احسان کیا کرتا، اور انعام دیا کرتا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ تو میرا قاتل ہے، ابن ملجم نے رو کر جواب دیا: اے امیر المومنین! کیا آپ سے ہو سکتا ہے کہ جہنمی کو جنتی بنا دیں۔ آپ نے امام حسن علیہ السلام سے فرمایا، اے لڑکے اس قیدی کے ساتھ نرمی اور رحم اور شفقت کرنا، کیا نہیں دیکھتے

ہو مارے خوف کے اس کی آنکھیں اندر گھس گئی ہیں اور دل اڑ رہا ہے، امام حسن نے عرض کی کہ اس لعین نے آپ کو قتل کیا اور ہمارے دلوں کو دکھایا، اس پر آپ نرمی کرنے کو فرماتے ہیں، فرمایا: ''یا بنی نحن اهل بية، الرحمة و المغفرة، لا نزداد علی المذنب الینا الا عفوا و کرما ''یعنی ہم اس گھرانے کے لوگ ہیں جن کی طبیعت میں رحم اور مغفرت ہے، اگر کوئی ہم پر ظلم کرے تو ہم ان کو از راہ کرم معاف کر دیتے ہیں انتہی۔

اور نہج البلاغہ (جلد: ۲ صفحہ ۱۳) میں ہے کہ انتقال کے قریب امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے قاتل ابن لجم کے بارے میں یہ وصیت کی۔ ''انا بالا مس صاحبکم و الیوم عبرة لکم و غدا مفارقکم ان أبق فانا ولی دمی و ان أفن فالفناء میعادی و ان أعف فالعفو لی قربة و هو لکم حسنة فاعفوا ألا تحبون ان یغفر الله لکم ''یعنی کل میں تمہارا صاحب اور رفیق تھا اور آج تمہارے لئے عبرت ہوں اور کل تم سے جدا ہو جاؤں گا۔ اگر میں زندہ رہوں تو اپنے خون کا آپ مالک ہوں اور اگر مر جاؤں تو فنا ایک مقررہ بات ہے، اگر اپنا خون معاف کردوں تو وہ میرے لئے تقرب الٰہی اور تمہارے لئے حسنہ ہے اس لئے تم معاف کر دو۔ کیا تم اس بات کو دوست نہیں رکھتے کہ خدائے تعالیٰ تمہاری مغفرت کرے انتہی۔

دیکھئے آپ نے اپنے قاتل کو بھی ملعون نہیں کہا، بلکہ ''یا هــــذا '' کہہ کے خطاب فرمایا۔ اگر یا ملعون فرماتے تو خلاف واقع نہ ہوتا۔ پھر اپنے خاندان کا خاصہ بیان فرمایا کہ کوئی ہم پر کیسا ہی ظلم کرے ہم اس کو معاف کر دیا کرتے ہیں، اور صرف معاف ہی نہیں

کرتے بلکہ اس پر کرم بھی کرتے ہیں۔ ''لسان العرب '' میں کرم کے معنی کثرت خیر وجود وعطا لکھا ہے۔اب غور کیجئے کہ قاتل پر جب یہ لطف وکرم ہو تو معاویہؓ وغیرہ مخالفین کو تو آپ نے اپنا بھائی فرمایا۔ کیا ممکن ہے کہ صرف اسی ہی سال کی اذیت رسانی سے ان کے اس قدر بدخواہ ہو گئے ہوں گے کہ ان کے حق میں ایسی بددعا کی کہ قیامت میں بھی رحمت الٰہی سے دور ہو جاویں۔ ہمارا تو حسن ظن بلکہ یقین یہی ہے کہ اگر آپ نے لعنت بھی کی تو اس میں بھی اپنے خاندانی رحم اور مغفرت کو ملحوظ رکھا اور یہی دعا کی کہ الٰہی ہمارے بھائیوں کو قیامت کے روز ان کے ہم جنسوں میں ذلیل وخوار نہ کیجو، صرف اتنا کر کے مجاہدہ نفس میں تائید دے جس سے خود بخود ان کی نفس کشی ہو جائے اور ناکامی کی حسرت کا ثواب پاویں۔ اگر باوجود ایسے قرائن واضحہ کے ہم ایسے اکرم الناس سے حسن ظن نہ کریں تو پھر حسن ظن کا موقع ہی ہمیں کہاں ملے گا، ہمیشہ بدگمانی کے جنجال میں پڑے رہیں گے۔ جس کی نسبت خدائے تعالیٰ فرماتا ہے ﴿ان بعض الظن اثم﴾ یعنی بعض گمان گناہ ہیں۔ وما توفیقنا الا باللہ کہ ان کے حق لینے کے معاوضہ میں گالیاں دیں۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ اگر حق خلافت آپ کو تھا بھی تو آپ نے ترک کر دیا تھا چنانچہ آپ کا بیعت کرنا اس پر دلیل واضح ہے جو باتفاق فریقین ثابت ہے اور اس کے سوا آپ نے کھلے الفاظ میں فرما دیا کہ اگر ان سے بے احتیاطی ہوئی بھی تو ہم نے معاف کر دیا۔

ابوبکرؓ وعمرؓ کی تعریف اور معافی حق:

چنانچہ ناسخ التواریخ صفحہ ۲۴۱ میں آپ کا قول لکھا ہے کہ ''لم استخلف الناس

ابابکر ثم استخلف ابوبکر عمر و احسنا السیرۃ و عدلا فی الامۃ و قد و جدنا علیھما ان الا مردوننا و نحن آل الرسول و احقّ بالامر فغفرنا ذلک لھما ‘‘۔یعنی لوگوں نے ابوبکر کو خلیفہ مقرر کیا اور ابوبکر نے عمر کو، اور دونوں نے عمدہ خصلتیں اختیار کیں اور امت میں عدل کیا، اگرچیکہ ہم کو ان پر غصہ آیا کہ باوجود ہم آل رسول اور مستحق موجود ہونے کے وہ متولیٔ خلافت ہوگئے مگر ہم نے ان دونوں کی زیادتی کو معاف کردیا۔

اب کہئے کہ معاف کئے ہوئے حق کا مواخدہ کس طرح جائز ہوگا۔قطع نظر اس کے حق تعالیٰ قرآن شریف میں مہاجرین وانصار کا ذکر کرکے فرماتا ہے﴿**والذین جاء وا من بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا ولا خواننا الذین سبقونا بالایمان و لا تجعل فی قلو بنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رؤف رحیم**﴾یعنی مہاجرین وانصار کے بعد جولوگ آئے انہوں نے کہا کہ اے رب ہمیں بخش دے اور ہمارے ان مسلمانوں بھائیوں کو بھی بخش دے جو پہلے گذرے، اور جو لوگ ایمان لائے ان کی طرف سے ہمارے دل میں کینہ مت رکھ، اے رب تو رؤف ورحیم ہے انتہی ۔

دیکھئے کہ مسلمانوں کی تو یہ حالت ہے کہ دعائیں کرتے ہیں کہ ہمارے دل میں مہاجرین وانصار کا کین نہ آنیپائے اور ان کی مغفرت کی دعائیں کرتے ہیں اور احادیث سے بھی ثابت ہے کہ صحابہ کو خیر سے یاد کرنا چاہئے اور خود علی کرم اللہ وجہہ بھی یہی تعلیم فرماتے ہیں۔تو اب یہ کیونکر باور ہوسکتا ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ ان نصوص کی مخالفت کرکے

صحابۂ کبار کو گالیاں دیتے ہوں گے؟ جو لوگ کسی ملت و مذہب میں کوئی نئی بات ایجاد کرنا چاہتے ہیں تو اس کے جمیع پہلو اور جوانب پر نظر ڈالنے کے بعد ایسے امور کے ایجا کی انہیں ضرورت ہوتی ہے جن کا اس مذہب و ملت میں اصل ہی نہ ہو، باوجود اس کے ان کو مہتم بالشان بنا دیتے ہیں۔ اس نظیر سے اس کا ثبوت ہو سکتا ہے کہ توارات میں یہ بات تھی کہ جو شخص سولی پر چڑھایا جائے وہ ملعون ہے، یہود چونکہ عیسی علیہ السلام کے دشمن تھے، انہوں نے یہ خیال کیا کہ اگر ان کو کسی طرح سولی پر چڑھا دیں تو ان کا دعوئے نبوت خود باطل ہو جاتا ہے، عیسی علیہ السلام چونکہ آزادانہ جنگلوں میں زندگی بسر کرتے تھے ان کو گرفتار کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا، ااخر حوارین میں سے ایک شخص کو بمشکل اس کام پر آمادہ کیا چنانچہ اس نے آپ کو گرفتار کرایا اور انہوں نے آپ کو فوراً سولی پر چڑھانا چاہا مگر منجانب اللہ آپ تو آسمان پر اٹھا لئے گئے اور ایک شخص جو آپ کے مشابہ تھا اس کو انہوں نے سولی پر چڑھایا، جیسا کہ قرآن شریف سے ثابت ہے۔ حوارین کو اس گڑبڑ میں خبر نہیں ہوئی کہ عیسی علیہ السلام اٹھا لئے گئے اور دیکھا کہ ایک شخص سولی پر چڑھایا گیا ہے اور مشابہت کی وجہ سے وہ امتیاز نہ کر سکے۔ اس وجہ سے ان کو مجبوراً ماننا پڑا کہ عیسی علیہ السلام سولی پر چڑھائے گئے۔

اب مشکل یہ ہوئی کہ نعوذ باللہ عیسی علیہ السلام بحسب توریب ملعون سمجھے جائیں، جس کی وجہ سے آپ کا نبی ہونا باطل ہوا جاتا ہے؟ اس کا جواب انہوں نے یہ تجویم کیا کہ بیشک عیسی علیہ السلام ملعون تو ہوئے مگر اس کی حاص وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے ذمہ لعنت لے کر سب کی طرف سے کفارہ ہو گئے۔ اور سب کے گناہ بخشوانے کے لئے دوزخ میں گئے اور

اس مسئلہ کفارہ پر اس قدر زور دیا کہ اس کو ایک دینی مسئلہ بنا کر چھوڑا۔ اس طرح ابن سبا نے دیکھا کہ سب نئے مسائل تو چل جائیں گے، مگر الوہیت کا مسئلہ چلنا دشوار ہے اس لئے کہ علی کرم اللہ وجہہ پرلے درجہ کے عابد ہیں اور خدا کو عبدات کرنے سے کیا تعلق؟ اس کی تدبیر یہ سوچی کہ پہلے ان کے قول وفعل بے اعتبار ثابت کر دیئے جائیں۔ چنانچہ اسی غرض سے تقیہ کی بنیاد ڈالی۔ اور یہ ذہین نشین کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو چھپانا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے خدا ہونے سے بھی انکار کرتے ہیں اور دکھلانے کیلئے عبادت کرتے ہیں، اور جن لوگوں کے ذہنوں میں وصی اور خلیفہ ہونا ثابت کیا تھا، ان سے کہا کہ ان کا خلفائے ثلاثہ کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور ان کی رفاقت دینی اور اتحاد ظاہر کرنا سب تقیہ کی راہ سے تھا، جتنے قول اور فعل ان کے اس باب میں وارد ہیں کوئی اعتبار کے قابل نہیں۔ اور اس مسئلہ پر اتنا زور دیا کہ ضروریات دین میں داخل کر دیا اور وہ مسئلہ اس قدر مستحکم اور راسخ ہوا کہ ہر چند آپ نے دلائل قائم کئے اور پیشانی اور ناک زمین پر رگڑ رگڑ کر اپنی عبودیت کا ثبوت دیا مگر کسی نے نہ مانا اور صاف کہدیا کہ آپ کے قول اعتبار کے قابل ہیں نہ فعل۔ اسی طرح خلافت مستقلہ جن لوگوں کے ذہن نشین کی انہوں نے آپ کے ان اقوال کو قابل اعتبار نہ سمجھا جن سے ابوبکرؓ کی فضیلت اور ان کے ہاتھ پر آپ کا خوشی سے بیعت کرنا ثابت ہوتا ہے۔ اور ترک مخالفت ظاہری کو تقیہ پر محمول کیا۔

اصل تقیہ کا اثبات اس آیت شریفہ سے ہوتا ہے ﴿لا یتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء من دون المؤمنین و من یفعل ذلک فلیس من اللہ فی

شئی الا ان تتقوا منهم تقة و يحذركم الله نفسه و الی الله المصير ﴾یعنی مسلمانوں کو نہ چاہئے کہ سوائے مسلمانوں کے کافروں کو اپنا دوست بنالیں، اور اگر کوئی ایسا کرے تو اس سے اور اللہ سے کوئی سروکار نہیں، مگر اس تدبیر سے کسی طرح ان کے شر سے بچنا ہو تو مضائقہ نہیں، اور اللہ اپنے جلال سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کے طرف آخر کار جانا ہے انتہی۔

یہ بات ظاہر ہے کہ جو شخص مسلمانوں کو دوست نہ رکھ کر کافروں کو دوست بنالے گا وہ کافر ہی سمجھا جائے گا۔ اس لئے کہ جب مسلمانوں سے دینی اخوت ہوگئی تو اس کا لازمہ محبت باہمی ہوگا، پھر ان سے محبت نہ رکھ کر کافروں سے محبت رکھنا بغیر اس کے نہیں کہ کفر کی طرف میلان ہو۔

اس لئے ضروری ارشاد ہے کہ جو ایسا کرے گا اس کو دین سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں اگر کسی قسم کا ان سے خوف ہو تو ظاہراً محبت رکھ سکتے ہیں، بشرطیکہ دل میں خوف خدا لگا رہے۔ اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں سے دل میں دشمنی رکھ کر محبت ظاہر کی جائے بلکہ دوسری آیتوں سے ثابت ہے کہ صحابہ میں باہمی محبت تھی۔ چنانچہ حق تعالی فرماتا ہے: ﴿**رحماء بينهم**﴾ یعنی مسلمان ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں جس کا نتیجہ اور منشا محبت ہے، اور ارشاد ہے قولہ تعالی ﴿**فا صبحتم بنعمته اخوانا**﴾ یعنی خدائے تعالیٰ کی نعمت اور فضل کی وجہ سے جن قبیلوں اور افراد میں مخالفتیں تھیں وہ دفع ہو کر سب آپس میں بھائی بھائی ہوگئے۔ اس کا ثبوت ناسخ التواریخ وغیرہ سے بآسانی مل سکتا ہے کہ صحابہ ایک

دوسرے پرکیسی جان نثاریاں کرتے تھے۔ جتنے جنگ کفار کے ساتھ ہوئے ان کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کنفس واحدۃ تھے۔ خالد بن ولیدؓ جیسے جوانمردونازک مزاج شخص جب معزول کئے گئے اور ابوعبیدہؓ کی ماتحتی میں کام کرنے کا حکم ان کو عمرؓ نے دیا تو انہیں ذرا بھی اس کا خیال وملال نہ ہوا کہ اب تک جن کے افسر تھے ان کے محکوم بن رہے ہیں، اور وہی جانفشانیاں کیں جو پیشتر کرتے تھے۔ اگر دلوں میں عداوت ہوتی تو کبھی اتنے تھوڑے لوگ بری بری نامی گرامی سلطنتوں کو تھوڑی سی مدت میں فتح نہ کرسکتے۔ اب غور کیجئے کہ علی کرم اللہ وجہہ جیسے اعلی درجہ کے صحابی نے مسلمانوں کے ساتھ اس تقیہ کی بنیاد ڈالی جو کافروں کے ساتھ کرنا چاہئے؟ اگر کہا جائے کہ آپ صحابہ کو کافر سمجھتے تھے، تو یہ ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا بلکہ ابھی ثابت ہوا کہ آپ سب صحابہ کو اعلی درجہ کے مسلمان سمجھتے تھے پھر مسلمانوں کے ساتھ دل میں بغض اور کینہ رکھ کر ظاہر اماہنت کرنا شان مرتضوی کے مناسب کیونکر ہوسکتا ہے؟

اور اس آیت شریفہ سے بھی جواز تقیہ پر استدلال ہوتا ہے: قولہ تعالی ﴿**من كفر بالله من بعد ايمانه الا من اكره و قلبه مطمئن بالا يمان و لكن من شرح بالكفر صدراً فعليهم غضب من الله و لهم عذاب عظيم**﴾ یعنی جو لوگ ایمان لانے کے بعد دل سے کافر ہوتے ہیں تو ان پر خدا کا غضب ہے، اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے، اور کسی پر اکراہ اور زبردستی کی گئی اور اس نے زبان سے کلمہ کفر کہہ دیا لیکن دل کی کیفیت ایمانی میں تغیر نہ آیا ہو تو اس کا مضائقہ نہیں۔ تفسیر ابن جریر وغیرہ میں لکھا ہے کہ عمار

بن یاسرؓ پر کفار نے سخت عذاب کیا اور پانی میں ان کو غوطے دیئے کہ ایمان سے پھر جائیں۔ اس وقت انہوں نے جان بچانے کے لئے کوئی کلمۂ کفر کہہ دیا اور آنحضرت ﷺ سے اس کی شکایت کی آپ نے پوچھا: اس وقت تمہارے دل کی کیا حالت تھی؟ کہا اطمینان تھا۔ فرمایا: اگر آئندہ بھی ایسا موقع ہو جائے تو کہہ دینا۔ اور اسی پر یہ آیت شریفہ نازل ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ جان بچانے کی ضرورت سے تقیہ کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ناسخ التواریخ میں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جہاں کوئی روایت انہوں نے ایسی نقل کی جس سے علی کرم اللہ وجہہ سے خلفاء ثلاثہ کی تعریف یا ان کی خلافت کا اعتراف ثابت ہوتا ہے تو لکھ دیتے ہیں کہ یہ بطور تقیہ تھا۔ اور یہ روایت بھی اس میں نقل کی ہے کہ "لا دین لمن لا تقیة لہ" یعنی جس نے تقیہ نہ کیا وہ دیندار نہیں۔ اگر اس کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ دیندار کو بات بات میں تقیہ کی ضرورت ہے تو لازم آئے گا کہ کوئی دیندار راستباز نہ ہو سکے، حالانکہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ مسلمان کو صادق اور استباز ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ صادقین کی تعریف اکثر مقامات میں قرآن شریف میں مذکور ہے۔ اور اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ جان بچانے کے واسطے تقیہ کا مضائقہ نہیں، جس طرح قرآن شریف سے ثابت ہے تو علی کرم اللہ وجہہ کا ان امور میں تقیہ کرنا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ناسخ التواریخ سے یہ روایت ابھی نقل کی گئی کہ آپ نے خطبہ میں قسم کھا کر فرمایا کہ میں حکومت کو مکروہ سمجھا تھا اس لے کہ خود میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو کوئی میرے بعد والی بنایا جائے گا قیامت کے روز پلصراط پر کھڑا کیا جائے گا، پھر اگر وہ عادل ثابت نہ ہوگا تو دوزخ میں گرا

دیا جائے گا۔ دیکھئے یہ آپ اس وقت فرما رہے ہیں کہ تمام مسلمان آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے، اور کوئی مخالف نہ تھا اور نہ کسی کی مخالفت کا خیال تھا۔ اس لئے کہ یہ خطبہ خلافت کے دوسرے روز آپ نے پڑھا، جیسا کہ ناسخ التواریخ کی جلد سوم صفحہ (۲۰) میں مصرح ہے اور نیز نہج البلاغہ کی روایت بھی ابھی لکھی گئی کہ آپ نے قسم کھا کر فرمایا کہ مجھے خلافت اور حکومت کی بالکل خواہش نہ تھی۔ اب غور کیجئے کہ جب کل مسلمانوں نے آپ کو خلیفہ تسلیم کیا تو اب کس کا خوف تھا جس کی وجہ سے تقیہ کرنے کی ضرورت ہو۔ غرض کہ اس سے بداہستہ ثابت ہے کہ آپ نے قسم کھا کر مسلمانوں کو یہ باور کرا دیا کہ بحسب حدیث شریف قیامت کے خوف سے آپ نے خلافت کا کبھی ارادہ کیا نہ خواہش، اور خلفائے ثلثہ کو مسلمانوں نے جو خلیفہ بنایا تھا اس کو آپ غنیمت سمجھتے تھے، کیونکہ اگر اس وقت بھی لوگ اگر آپ ہی کو مجبور کرتے تو بمجبوری آپ کو ان کا قول ماننا پڑتا جیسا کہ اس وقت مجبور ہو کر آپ نے مان لیا، جو آپ کی اس عبارت سے ظاہر ہے۔ ''و لکنی لما اجتمعت رابکم لم یسعنی ترککم'' اب اس کے بعد وہ روایتیں جن سے آپ کا خلفائے ثلاثہ کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور ہمیشہ ان کی تائید میں رہنا جن کو حضرات شیعہ خود بھی تسلیم کرتے ہیں ثابت ہوں گی۔

ناسخ التواریخ کی جلد سوم (٦٣) میں لکھا ہے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے طلحہ اور زبیر کے نام ایک خط لکھا جس میں یہ مضمون بھی تھا۔ پس اگر شما از طوع و رغبت با من بیعت کردید بیفر مانی نکنید و بتوبت و انابت گروائید اگر از رہ کراہت بودید ایں خود حجتے

است برشما کہ کار بہ نفاق اور روید در ظاہر اطاعت کردید و در باطن معصیت ورزیدید۔ دیکھئے بیعت تقیہ کو نفاق میں داخل فرمایا جس کی نسبت حق تعالیٰ فرماتا ہے ﴿**ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار**﴾ یعنی منافق دوزخ کے نیچے کے طبقہ میں رہیں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ نے جس بیعت کو بیعتِ منافقانہ نام رکھا وہ بیعت ہرگز نہیں کی تھی۔ اور جتنی روایتیں اس باب میں اس قسم کی بیعت کی بیان کی جاتی ہیں سب ابن سبا کی بنائی ہوئی ہیں۔

ناسخ التواریخ کی جلد سوم صفحہ (۴۷۱) میں لکھا ہے کہ جب معاویہؓ نے آپ پر عثمانؓ کے قتل کا الزام لگایا تو آپ نے اس سے انکار فرمایا، مگر یہ انکار تقیہ کی راہ سے تھا، ورنہ آپ ان کو واجب القتل جانتے تھے۔

یہ علامہ مصنف کی مجرد رائے ہے، ہم ہرگز اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ابھی معلوم ہوا کہ بیس ہزار (۲۰۰۰۰) شخص امیر المومنین علیہ السلام کے لشکر میں ایسے موجود تھے جو اپنے آپ کو قاتل عثمانؓ کہتے تھے۔ اتنا لشکر کثیر ہمخیال ہونے کے بعد آپ کو تقیہ کرنے کی کیا ضرورت تھی، کیونکہ تقیہ صرف جان بچانے کے لئے مقرر ہوا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایسے شخص نہ تھے کہ کسی کے خوف سے کوئی جھوٹ بات کہہ دیتے، معاویہؓ کے مقابلہ میں تنہا بہ نفس نفیس جو داد شجاعت آپ نے دی صفحہ ہستی پر یادگار ہے، پھر جب بیس ہزار فوج کی کمک بھی ہو تو کہئے اب آپ کو کون شہید کر سکتا تھا۔ اور اگر جان بچانے کا خیال تھا تو جنگ صفین وغیرہ کی نوبت ہی کیوں آئی۔

غرضکہ قرائن عقلیہ ونقلیہ سے ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا کہ علی کرم اللہ وجہہ نے جان کے خوف سے کبھی تقیہ کیا ہو، کیونکہ تقیہ دراصل کذب کا نام ہے، جس کی اجازت اشد ضرورت کے وقت ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نہایت صادق شخص تھے۔ کیوں نہ ہو، کل صحابہ کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی بات کہتے سچی کہتے۔ چنانچہ نہج البلاغہ (ج ۱: صفحہ ۱۴۵) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول نقل کیا ہے جو صحابہ کی تعریف میں آپ نے فرمایا: ’’ھم کنوز الرحمن إن نطقوا صدقوا ‘‘ یعنی صحابہ رحمٰن کے خزانے ہیں، ان کی حالت یہ ہے کہ جب بات کرتے ہیں تو سچ کہتے ہیں۔ اور نہج البلاغہ (ج ۔۲۔ صفحہ ۹۰) میں منقول ہے کہ کسی نے آپ سے ایمان کا حال پوچھا، فرمایا: اس کے چار دعائم اور ستون ہیں: صبر، یقین، عدل اور جہاد، ۔۔۔ پھر جہاد کے حال میں فرمایا کہ اس کے چار شعبہ ہیں: ’’الامر بالمعروف و النھی عن المنکرو الصدق فی المواطن ‘‘ یعنی معرکۂ جنگ وغیرہ میں سچی بات کہنی۔ وشنآن الفاسقین یعنی فاسقوں سے دشمنی۔ دیکھئے باوجودیکہ جنگ کے موقعہ میں خدعہ درست ہے مگر آپ فرماتے ہیں کہ اس موقعہ میں بھی صدق کی ضرورت ہے، یہاں تک کہ اس کو ایمان کا رکن قرار دیا۔ اب غور کیجئے کہ تقیہ جو خلاف واقع ظاہر کرنے کا نام ہے، اس پر صدق کیونکر صادق آئیگا۔ اس سے ثابت ہے کہ تقیہ آپ کے نزدیک قریب قریب کفر کے ہے۔

مدح صدق:

اور نیز نہج البلاغہ (ج ۔۲۔ صفحہ ۹۳) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

’’قدر الرجل عی قدر همته و صدقه علی قدر مروته ‘‘یعنی آدمی کی قدر اس کی ہمت کے مقدار پر ہے اور اس کا صدق اس کی مروت یعنی انسانیت کے اندازہ پر۔ اب آپ کی ہمت کا اندازہ کیجئے! نہج البلاغہ (ج۔۲ صفحہ ۴۵) میں ہے کہ آپ فرماتے ہیں: ’’والله لو تظاهرت العرب علی قتالی لما ولیت عنها‘‘۔یعنی خدا کی قسم اگر تمام عرب ایک دوسرے کی مدد کر کے مجھ سے جنگ کرنا چاہیں تو میں ہرگز ان سے منہ نہ موڑوں گا انتہی۔

اب کہئے کہ جن کی یہ ہمت ہو، ان کی نسبت یہ خیال کرنا کہ ان کے قول وفعل میں کسی خوف کی وجہ سے صدق نہ تھا۔ کس قدر آپ کی بیقدری ہوگی۔

نہج البلاغہ (ج:۱۔صفحہ ۲۱) میں لکھا ہے: ’’ومن کلام له علیه السلام یعنی به الزبیر فی حال اقتضت ذلک، یزعم انه قد بایع بیده ولم یبایع بقلبه، فقد أقر بالبیعة وادعی الولیجة فلیأت علیها بأمر یعرف، والا فلید خل فیما خرج منه ‘‘یعنی زبیر کہتے ہیں کہ میں نے ہاتھ سے بیعت کی، دل سے نہیں کی، انہوں نے بیعت کا اقرار تو کرلیا، اب رہی یہ بات کہ دل میں کچھ اور تھا تو چاہئے کہ اس پر کوئی ایسی دلیل پیش کریں جس کو سب قبول کرلیں ورنہ ضرور ہوگا کہ بیعت میں داخل ہو جائیں انتہی۔

اور نیز نہج البلاغۃ (ج:۲ صفحہ ٦٨) میں آپ کا خط نقل کیا ہے جو طلحہ اور زبیر کے نام آپ نے لکھا، جس میں یہ عبارت منقول ہے:

’’و ان کنتما با یعتمانی کارهین فقد جعلتمالی علیکما السبیل

باظهار كما الطاعة و اسرار كما المعصية و لعمرى ما كنتما باحق المهاجرين بالتقبة و الكتمان. و ان دفعكما هذا الامر من قبل ان تد خلا فيه كان اوسع عليكما من خروجكما منه بعد اقرار كما به ’’یعنی تم دونوں نے اگر کراہیت سے میرے ہاتھ پر بیعت کی تھی تو تم پر الزام قائم ہوگیا، اس لئے کہ طاعت کو ظاہر کر کے تم نے دل میں نافرمانی چھپا رکھی۔ اب تم کو تقیہ کرنے کا کوئی حق نہ تھا، اگر پہلے ہی بیعت نہ کرتے تو گنجائش تھی، اب بیعت کے بعد خارج ہونا نہیں ہوسکتا۔

دیکھئے کہ تقیہ کی بیعت کو بھی آپ نے بیعت ہی قرار دی، جس سے خارج ہونا درست نہیں۔ پھر جو کہا جاتا ہے کہ آپ نے خلفاء ثلاثہ کے ہاتھ پر تقیہ سے بیعت کی تھی۔ اس وجہ سے وہ قابل اعتبار نہیں، کیونکر صحیح ہوگا؟ اس لئے کہ اس قسم کی بیعت کا خود آپ نے اعتبار فرمایا ہے۔ اگر اپنی بیعت کو قابل اعتبار نہ سمجھتے تو طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما آپ کو صاف جواب دیتے کہ آپ نے بھی تو تقیہ کی بیعت کو قابل اعتبار نہیں سمجھا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مستدرک حاکم وغیرہ میں جو روایات ہیں کہ ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا آپ کو ملال نہ تھا، صرف شوریٰ میں شریک نہ کرنے کا رنج تھا۔ سو وہی بات صحیح ہے۔ اور جتنی روایتیں ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی فضیلت اور باہمی اتحاد و اتفاق کے بارے میں وارد ہیں سب صحیح اور سچی ہیں۔ اور جتنی روایتیں اس کے خلاف میں ہیں خواہ الوہیت سے متعلق ہوں یا رجعت سے یا خلافت متصلہ سے سب ابن سبا اور اس کے ساتھیوں کی بنائی ہوئی ہیں۔

فتنہء وضع احادیث

اور یہ بات کہ ابن سبا کے جیسے لوگوں نے احادیث وآثار بنا بنا کر لوگوں میں مشہور کیئے کوئی قابل تعجب نہیں، اس لئے کہ جب اسلام ترقی کرنے لگا اور دوسرے ملت و مذہب والوں کو ہر طرح مایوسی ہوئی تو اس فکر میں ہوئے کہ کچھ نہ ہو تو مسلمانوں کے عقائد تو ضرور خراب کر دیئے جائیں۔ عبداللہ بن سبا جیسے خوش تقریر جادو بیان جن میں اغوا اور گمراہ کرنے کا مادہ تھا اور شیطنت میں ید طولی رکھتے تھے وہ اس میں لگ گئے، اور ایک جماعت کو اس کام پر مامور کیا کہ مسلمانوں کے ہم خیال بنیں، اور ان کے علوم حاصل کر کے ایسی ایسی حدیثیں بنائیں کہ مسلمانوں میں مخالفت قائم ہو جائے۔ اور ان کے عقیدے فاسد ہو جائیں۔ چنانچہ بلاد اسلامیہ میں ہر طرف اس خیال کے لوگ پھیلے اور بڑے بڑے مجمعوں میں ''حدثنا فلاں وفلاں'' کہہ کر اپنی بنائی ہوئی حدیثیں رواج دینے لگے۔ چنانچہ ''میزان الاعتدال'' صفحہ (۲۱) میں امام ذہبی نے لکھا ہے کہ جعفر بن محمد طیالسی نے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک بار احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے مسجد رصافہ میں نماز پڑھی، دیکھا کہ نماز کے بعد ایک واعظ کھڑا ہوا اور حدیث بیان کرنے لگا جس کی اسناد یہ تھی: ''**حدثنا احمد بن حنبل و یحیی بن معین قالا حدثنا عبدالرزاق عن معمر عن قتادۃ عن انس قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم**''۔ امام احمد اور یحییٰ بن معین ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور دونوں نے اشاروں سے آپس میں کہا کہ ہم نے یہ روایت نہیں کی۔ جب وعظ ختم ہو گیا تو یحیی بن معین نے اس کو جا پکڑا اور کہا کہ یہ حدیث تجھ سے کس

نے بیان کی، یحییٰ بن معین تو میں ہوں اور یہ احمد بن حنبل ہیں اور ہمیں معلوم بھی نہیں کہ یہ حدیث ہے۔ اگر تجھے جھوٹ کہنا ہی تھا تو اور کسی غائب شخص کا نام لیتا۔ اس نے پوچھا کہ کیا تم یحییٰ بن معین ہو؟ کہا ہاں! کہا: میں سنا کرتا تھا کہ ایک احمق شخص ہے جس کا نام یحییٰ بن معین ہے مگر مجھے یقین نہ تھا، اب اس کا یقین بھی ہوگیا۔ اے احمق! تو یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں کوئی احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین تم دونوں کے سوا نہیں۔ سترہ احمد بن حنبل ان کے سوا ہیں جن سے میں نے روایتیں لی ہیں۔ امام احمد شرمندہ ہوگئے اور کہا کہ چھوڑ دو اس کو، چنانچہ وہ استہزاء کرتا چلا گیا۔

''تدریب الراوی'' صفحہ (۱۰۳) میں امام سیوطی نے حماد بن زید کا قول نقل کیا ہے کہ زنادقہ نے چودہ ہزار حدیثیں بنائی ہیں۔ انتہی۔ ان کے سوا بعض خوش اعتقادی سے بھی حدیثیں بناتے تھے۔ چنانچہ تدریب الراوی صفحہ (۱۰۲) میں لکھا ہے کہ میسرہ بن عبدربہ ایک نوجوان بڑے زاہد و عابد شخص تھے، ان کو دنیا سے کوئی تعلق نہ تھا اور ان کی یہ وجاہت اور تقدس مشہور تھا کہ ان کا جب انتقال ہوا تو بغداد میں ہڑتال ہوگئی اور بازاروں کی دوکانیں بند ہوگئیں۔ ایسے شخص کا یہ حال تھا کہ نیک نیتی سے حدیثیں بنایا کرتے تھے، چنانچہ ابن مہدی کہتے ہیں کہ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے وہ رواتیں کہاں سے لائیں کہ جو فلاں سورہ پڑھے اس کو یہ ثواب ہے اور ولاں سورہ کا یہ ثواب۔ کہا: لوگوں کو رغبت دلانے کی غرض سے یہ حدیثیں میں نے بنائی ہیں۔ ان کے انتقال کے وقت کسی نے یہ کہا کہ اس وقت خدائے تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن کرو۔ کہا: میں نے علیؓ کے فضائل میں ستر حدیثیں بنائی

ہیں۔ کیا اب بھی مجھے حُسنِ ظن نہ ہوگا۔

غور کیجئے کہ جب حضرت کی فضائل کی حدیثیں بنانا باعث مغفرت سمجھا جاتا تھا تو کتنی حدیثیں بحسب ضرورت تیار کر لی گئی ہوں گی، اسی وجہ سے محدثین کو تنقیح وتنقید کی ضروت ہوئی۔ پھر جس طرح محبین اہل بیت نے علی کرم اللہ وجہہ اور ائمہء اطہار کے فضائل اور دوسرے صحابہ کے مناقص میں حدیثیں بنائیں۔ اسی طرح ان کے دشمنوں نے اقسام کی باتیں اور حدیثیں تراشیں جو ان کے خلاف میں ہیں، کیونکہ آخر مخالفین میں بھی علماء اور اس شان کے لوگ تھے جو جواب ترکی بہ ترکی دیں۔

غرض کہ طرفین سے حدیثیں مع اسناد باضابطہ وقتاً فوقتاً تیار ہوتی گئیں اور جن علماء کو حدیث میں تبحر نہ تھا انھوں نے ان حدیثوں کو اپنی کتابوں میں درج کر دیا، چنانچہ اب تک وہی حدیثیں استدلال میں پیش ہوتی جاتی ہیں۔

طرفین کی تراشیدہ روایات:

اب ہم بطور مثال چند امور پر بیان کرتے ہیں جو طرفین میں تراشی گئی ہیں، اور ان پر اعتقاد جمے ہوئے ہیں۔

''دبستان مذاہب'' صفحہ (۲۱۷) میں لکھا ہے کہ امویہ ویزیدیہ کہتے ہیں کہ علی کرم اللہ وجہہ نے الوہیت کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ ان کے اس خطبہ میں جس کا نام ''خطبۃ البیان'' ہے یہ عبارت موجود ہے: ''**انا اللہ و انا الرحمن و انا الرحیم و انا الخالق و انا الرزاق و انا الحنان و انا المنان و انا المصور النطقة فی الارحام**'' کیا یہ

خیال ہوسکتا ہے کہ حضرت علیؓ نے عین خطبہ میں ایسا دعویٰ کیا ہوگا، مخالفین کہتے ہیں الوہیت تو درکنار ان کا اسلام بھی ثابت نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ آیت شریفہ ﴿**ومن الناس من یعجبک قولہ فی الحیوۃ الدنیا و یشہد اللہ علی مافی قلبہ و ھو الد الخصام**﴾ الایۃ آپ ہی کی شان میں معاذ اللہ نازل ہوئی، جس کے آخر میں ﴿**فحسبہ جنھم**﴾ ہے۔ یہ ان کا عقیدہ دبستان مذاہب میں لکھا ہے۔ کیا کوئی ذی علم کہہ سکتا ہے کہ یہ آیت معاذ اللہ علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں نازل ہوئی ہوگی۔

''کتاب السیر'' صفحہ (۴۹) جو احمد بن سعید خارجی کی تصنیف ہے اس میں لکھا ہے کہ جب علی کرم اللہ وجہہ نے ابن عباسؓ کو خوارج کی طرف روانہ کیا تو انہوں نے سوال کیا کہ علی اور ان کے رفقا نے جو اہل بدعت کو بدعتیں کرنے اور کتاب اللہ پر نہ عمل کرنے کی وجہ سے قتل کیا، اور جنگ جمل میں جو اُن لوگوں کو قتل کیا جو اطاعت سے خارج ہو گئے تھے، اور اہل شام کو جو بغاوت کی وجہ سے قتل کیا، کیا یہ سب امور ہدایت تھے یا ضلالت؟

ابن عباسؓ: رشد اور ہدایت تھے۔

خوارج: پھر کیا اس کے بعد آسمان سے کوئی حکم نازل ہوا۔ جس کی وجہ سے وہ امور حرام ہو گئے۔

ابن عباسؓ: نہیں۔

خوارج: پھر اللہ کے دین میں کیوں حکم بنایا؟

ابن عباسؓ: تم جانتے ہو کہ حق تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ عورت و مرد کے معاملہ میں

کوئی شخص حکم بنایا جائے اسی طرح محرم پرندہ کو قتل کریں تو حکم بنانے کی ضرورت ہے۔ جب ایسے چھوٹے چھوٹے امور میں حکم بنانے کی ضرورت ہے تو مسلمانوں کی خونریزی کو موقوف کرنے کی غرض سے حکم بنانا کیونکر جائز نہ ہوگا!۔

خوارج: عورت، مرد اور پرندہ کے باب میں خدائے تعالی نے عدول کو حکم بنانے کا حکم فرمایا، اس میں حکم بنانا انتشال امر الہی ہوگا، بخلاف اس کے اگر حاکم چور کے ہاتھ کاٹنا چاہے اور لوگ اس مقدمہ میں کسی کو حکم بنانے کی درخواست کریں تو کیا حاکم حکم مقرر کرے گا یا بطور خود حکم الہی کو جاری کرے گا؟

ابن عباسؓ: حکم نہ بنائیگا بلکہ بطور خود حکم کو جاری کرے گا۔

خوارج: کیا عمرو بن عاص نے کھلے طور پر عداوت اور بغاوت نہیں کی، اور مصر کی حکومت کے بدلے اپنے دین کو نہیں بیچا اور ناحق مسلمانوں کی خونریزی نہیں کی، کیا باوجود اس کے وہ عدل تھے؟ اور ابوموسی اشعری نے باوجودیکہ لوگوں کو جہاد سے روکا کیا وہ عدل ہوسکتے ہیں؟

ابن عباسؓ: نہیں، یہ دونوں عدل نہ تھے۔

خوارج: اگر عمرو بن العاص عدل ہوں تو یہ ماننا پڑیگا کہ ہمارا ان سے جنگ کرنا ناحق اور ناجائز تھا، عمرو بن عاص نے ستر شعر رسول ﷺ کی دشمنی اور توہین میں لکھے اور حضرت نے دعا کی کہ الہی میں تو اس کے جواب میں شعر نہیں لکھ سکتا، ہر ایک شعر کے بدلے تو اس پر ایک لعنت کر۔ کیا ایسا شخص عدل ہوسکتا ہے؟ اگر وہ عدل ہوں تو یہ کہنا پڑے

گا کہ عمار اور جو اُن کے ساتھ شہید ہوئے، وہ گمراہی اور باطل پر تھے۔؟

ابن عباسؓ سے اس کا جواب نہ ہوسکا اور بے نیل مرام علیؓ کے پاس گئے اور خبر دی کہ تقریر میں خوارج غالب آ گئے۔ یہ سن کر علیؓ خود ان سے مناظرہ کرنے کو گئے اور یہ گفتگو ہوئی:۔

علیؓ: اہل شام نے چونکہ مجھے کتاب اللہ کی طرف بلایا تھا مجھے ان کا قبول کرنا ضرور تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿**الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب یدعون الی کتاب اللہ لیحکم بینهم ثم یتولی فریق منهم و هم معرضون**﴾ یعنی اے محمد ﷺ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ جب اہل کتاب کو کتاب اللہ کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ حکم کریں ان میں تو ایک فریق ان کا منہ پھیر لیتا ہے۔

خوارج: اس صورت میں معاویہ بمنزلہء مسلمانوں کے ہوئے، اور تم بمنزلہء اہل کتاب کے، اس لئے کہ انہوں نے تمہیں کتاب اللہ کی طرف بلایا تھا۔ اگر تم حق پر تھے تو کتاب اللہ کا صاف حکم تھا کہ ان کے ساتھ لڑو یہاں تک کہ وہ حق کی طرف رجوع کریں، کیونکہ تم خلیفہء برحق تھے اور وہ باغی۔

علیؓ: تمہیں نے تو کہا تھا کہ جو لوگ ہمیں قرآن کی طرف بلاتے ہیں ہم ان سے نہ لڑیں گے۔ اور میں کہہ چکا تھا کہ دیکھو یہ ان کا دھوکہ ہے۔ پھر میں نے ایسے شخص کو بھیجنا چاہا تھا کہ وہ لوگ جو گرہ دیتے وہ اس کو کھول سکتے تھے؛ یعنی ابن عباس کو مگر تم اس پر راضی نہ ہوئے، اور ابوموسی اشعری کو مقرر کرنے پر اتنا زور دیا کہ میں مجبور ہو گیا۔

خوارج: حق بات ہمارے سمجھ میں اب آئی اور اپنے گناہ سے ہم نے توبہ کی۔

علیؓ: میں بھی توبہ اور استغفار کرتا ہوں۔

مقصود یہ کہ خوارج نے حضرت علی کو توبہ کرا کر چھوڑا۔

اور لکھا ہے کہ علیؓ نے قیس بن سعد کو بھی مناظرہ کیلئے بھیجا تھا جن سے یہ گفتگو ہوئی:

قیس: امیر المؤمنین کتاب اللہ کے موافق حکم کرنا چاہتے ہیں۔

خوارج: کیا ان کے وکیل نے ان کو معزول نہیں کیا؟ پھر وہ امیر المؤمنین کیسے؟ مگر انہوں نے جب دیکھا کہ اپنے مطلب کے موافق ان کے وکیل نے حکم نہیں کیا تو ان کو غصہ آگیا اور یہ غصہ ان کی ذاتی غرض سے متعلق ہے، اس سے کیا ہوتا ہے، ان کا دین اور حکومت تو پہلے ہی چھین گئی۔

قیس: خیر اس کو جانے دو، اب اگر وہ توبہ کر کے تمہارے پاس آئیں تو کیا جب بھی تم ان کو قتل کروگے جس طرح تم نے عثمانؓ کو قتل کیا تھا۔

خوارج: یہ کیا کہتے ہو، عثمانؓ کو تو تم نے قتل کیا۔ کیونکہ وہ تمہارے حکم سے قتل کئے گئے۔

قیس: خیر علی کو میں توبہ کرا کے تمہارے پاس لاتا ہوں۔

یہ سن کر وہ خوش ہوئے اور انے گھوڑے چراگاہ میں چھوڑ دیئے اور ادھر علیؓ نے اپنی پوری فوج لے کر ان پر چڑھائی کی اور جب امیروں سے کہا کہ بالاتفاق ان پر حملہ کریں تو انہوں نے کہا کہ یہ تو ہم سے نہ ہو سکے گا، البتہ پہلے آپ ابتدا کروگے تو ہم آپ کی رفاقت

دیں گے اور اتباع کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے ایک تیر مارا اور تمام سوار ان لوگوں پر ٹوٹ پڑے، ان لوگوں نے لتوار کے میان توڑ دیئے اور مردانہ حملہ کیا، چنانچہ فقط ایک زید بن جویم نے تقریباً سو آدمیوں کو قتل کیا جن میں اکثر ہمدان کے لوگ تھے۔ علیؓ نے کہا: ایک شخص نے ہمدان کے خاندان کو فنا کر دیا، صبح سے ظہر تک معرکہء کارزار گرم رہا، علیؓ ایک طرف کھڑے کہہ رہے تھے: اے لوگو! خدا کی قسم تم ہی لوگوں نے عثمانؓ کے قتل کو انجام دیا، تم ہی لوگ جنگ جمل میں کامیاب ہوئے، اصحاب صفین تم ہی لوگ تھے، جب قرآن پڑھا جاتا تو تم ہی اصحاب قرآن تھے۔ ذوالعقیصہ نے جو علیؓ کے لشکر میں تھے یہ سن کر کہا: جب یہ اوصاف ان میں تھے تو پھر ہم کن لوگوں میں شمار کیے جائیں گے؟ یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ ماری اور ان میں جاملا، پھر عدی بن حاتم کے فرزند، زید بن حصین کا حال دریافت کرتے آئے کہ وہ کس لشکر میں ہیں؟ لوگوں نے کہا اس طرف، تو وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے۔ غرض کہ جو لوگ روئے زمین پر خیار اور اہل خیر شمار کیے جاتے تھے اس روز قتل کیے گئے، چنانچہ اویس قرنی بھی انہیں لوگوں میں شریک تھے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ قنبر نے مجھ سے کہا کہ لڑائی کے بعد علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ میں نہر پر گیا، دیکھا کہ علیؓ روتے روتے زمین پر گر گئے، میں نے رونے کا سبب دریافت کیا، فرمایا: اے کمبخت! ہم نے ایسے لوگوں کو یہاں قتل کیا جو اس امت میں بہتر اور قراء تھے پھر کہا: اپنے نفس کو تو میں نے شفا دی مگر اپنی ناک کاٹ لی اور بہت کچھ اظہار ندامت کیا۔ ؔ

ایک شخص نے علیؓ سے کہا کہ اگر حکم بنانا ہدایت کی بات تھی تو تم گمراہ ہوگئے، کیونکہ حکموں کے قول پر عمل نہ کیا اور عہد شکنی کی۔ اور اگر حکم بنانا گمراہی تھا تو اہل نہرواں کو جو تم نے قتل کیا وہ گمراہی تھی، اس لئے کہ وہ گمراہی سے تمہیں باز رکھنا چاہتے تھے۔

جب علیؓ کے لشکر والوں نے دیکھا کہ اہل خیر کو انہوں نے قتل کیا تو ایک ہی روز میں بارہ ہزار آدمی ان کے لشکر سے علیحدہ ہوگئے اور دوسرے روز تین سو آدمی اور اسی روز سے ادبار شروع ہوگیا۔ جب علیؓ کوفہ میں داخل ہوئے تو حسنؓ نے پوچھا: ائے والد بزرگوار کیا آپ نے ان لوگوں کو قتل کر ڈالا؟ کہا: ہاں۔ کہا: ان کا قاتل تو جنت کو دیکھ نہیں سکتا، کہا: کاش میں رینگتا ہوا جنت میں داخل ہوجاؤں۔

ابن عباسؓ نے حسنؓ سے کہا کہ تم اس گھرانے والے ہو کہ بنی اسرائیل کی طرف سرگرداں اور پریشان رہیں تو ان سے زیادہ تم اس کے مستحق ہو۔ پہلے تم کھڑے ہوئے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کریں گے اور جہاد کیا، پھر کتاب اللہ پر حکم مقرر کیا، پھر ایسے مسلمانوں کو قتل کیا جو سب سے بہتر اور فقہاء تھے جنہوں نے اپنے گوشت پوست اور ہڈیوں کو عبادت میں فنا اور اپنا مال راہ خدا میں خرچ کردیا۔

مسعود بن عبداللہ جب مدینہ کو گئے تو عائشہؓ نے ان کو بلا کر پوچھا کہ علیؓ نے اپنے اصحاب کو کیوں قتل کیا؟ انہوں نے پورا قصہ بیان کیا، کہا: ظلم کیا، پھر پوچھا: کیا مقتولوں میں سے کسی کا نام تم بتا سکتے ہو؟ کہا: ہاں! حرقوس بن ظہیر سعدی قتل کیا گیا، یہ سنتے ہی انہوں نے انا اللہ پڑھ کر کہا کہ میں گواہی دیتی ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں ایک روز

تشریف رکھتے تھے، فرمایا کہ اے عائشہ! جو شخص پہلے اس دروازہ سے آئے گا وہ جنتی ہے، تھوڑی دیر نہیں ہوئی تھی کہ حرقوس آیا، اس کی داڑھی سے پانی ٹپک رہا تھا پھر دوسرے روز بھی حضرت نے ایسا ہی فرمایا اور وہی پہلے داخل ہوا پھر تیسرے روز بھی ایسا ہی ہوا، غرض کہ اس کا قطعی جنتی ہونا حضرت ﷺ کی مکرر گواہیوں سے ثابت ہے۔ پھر پوچھا اور بھی کسی کا نام یاد ہے؟ کہا: ہاں زید بن حصین طائی، یہ سنتے ہی رونے لگیں اور کہا خدا کی قسم جس نیزے سے وہ مارے گئے اگر ساری امت اس پر جمع ہو تو خدا پر حق ہے کہ ان سب کو دوزخ میں ڈالے۔

شعبی کہتے ہیں کہ اہل نہروان کو قتل کرنے کے بعد علیؓ کو اپنی خلافت کے استحکام کی امید نہیں رہی، چنانچہ حسنؓ سے کہا کہ معاویہؓ کی بیعت کو مکروہ مت سمجھو۔

جابر بن زید کہتے ہیں کہ علیؓ جب خوارج کے قتل پر ندامت ظاہر کرنے لگے تو لوگوں نے کہا کہ آپ نے ان کو قتل بھی کیا اور اس پر ندامت بھی ظاہر کرتے ہو اور ان کے کام کو زینت دیتے ہو! آپ اس قابل ہو کہ معزول کئے جائیں۔ پھر دوسرے روز صبح کو کہا کہ ایک شخص کو لاشوں میں تلاش کرو، ڈھونڈنے میں نافع مولی ترملہ کی لاش ملی، جو صحابی اور نیک بخت شخص تھے جن کے ہاتھ کو اونٹ نے چاب ڈالا تھا، کہا: یہ وہی شخص ہے، حسنؓ نے کہا یہ تو نافع مولی ترملہ ہیں، کہا: خاموش رہو۔ حرب خدعہ ہے۔

یہ روایتیں ایسے شخص نے لکھی ہیں کہ جس کے نام کے ساتھ لفظ امام لکھا گیا ہے مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ روایتیں صحیح ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اس کے ہم مشرب خوارج چاہیں اس

کو امام کہیں یا اور کچھ مگر ہم تو یہی کہیں گے کہ یہ سب روایتیں بنائی ہوئی ہیں جیسا کہ کتب تواریخ وغیرہ کتب اہل سنت سے ظاہر ہے اور مناظرہ وغلبہ کی روایتیں جو اس میں مذکور ہوئیں بعینہ ایسی ہیں جیسے علامہ میر عنایت حسین صاحب نے رسالہ ''فیض عام'' میں.....جو ملا ابراہیم استر آبادی کے رسالہ عربی کا ترجمہ ہے .....ایک مناظرہ لکھ کر شائع کیا ہے کہ روایات صحیحہ اور اسانید معتبرہ سے ثابت ہے کہ حسینہ جو ایک لونڈی تھی اس نے امام جعفر صادقؓ کی شاگردی بیس برس کر کے علم میں وہ تبحر حاصل کیا کہ ایک روز اپنے مالک کے ساتھ ہارون امام ابو یوسفؒ ور امام شافعیؒ وغیرہ سر برآوردہ علمائے بغداد حاضر ہوئے اور مناظرہ شروع ہوا، اور بہت دیر تک ہوتا رہا، جس کی تفصیل بھی اس میں مذکور ہے، انجام کار ی ہ ہوا کہ حسینہ نے سب کو ایسا تنگ کیا کہ سب ہار گئے اور اس کے ضمن میں ابوبکر وعمر وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور علمائے اہ سنت کو دل کھول کر خوب ہی صلواتیں سنائیں اور سب کا کفر ثابت کیا۔ جس طرح خوارج حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کفر نعوذ باللہ ثابت کرتے ہیں۔ غرض کہ طرفین کی کتابیں دیکھی جائیں تو معلوہو کہ کیسی کیسی بے اصل باتیں تراشی گئیں۔

طرفین کی افراط وتفریط

''منہاج السنہ'' میں ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ بعضے شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت رقیہ اور ام کلثوم رضی اللہ عنہما جو عثمانؓ کی بیویاں تھیں وہ نبی کریم ﷺ کی صاحبزادیاں نہ تھیں، خدیجہؓ کے پہلے شوہر سے تھیں جو کافر تھا۔

''دبستان مذاہب'' میں خوارج کا قول نقل کیا ہے کہ حسنین از نژاد رسول اللہ ﷺ

نیستند بدیں آیت ﴿ما کان محمد ابا احد من رجالکم و لکن رسول اللہ و خاتم النبیین﴾ نعوذ باللہ من ذلک۔

''منہجا السنہ'' میں لکھا ہے کہ جب امام حسینؓ نے مخالفوں سے فرمایا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ میں ابن فاطمہ ہوں، انہوں نے جواب میں صاف کہد یا کہ خدا کی قسم ہم یہ نہیں جانتے۔ خوارج تو خوارج، نادر یہ ہے کہ شیعہ کے بھی ایک فرقہ کا اسی قسم کا اعتقاد ہے، چنانچہ ''منہاج السنہ'' جلد دوم صفحہ (۱۹۸) میں لکھا ہے: ''المتسبون الی الشیعة کالنصیرية و غیر هم یقولون ان الحسن و الحسین ما کانا اولاد علی بل اولاد سلمان الفارسی''۔ یعنی نصیریہ وغیرہ کہتے ہیں کہ امام حسنؓ و حسینؓ علی کرم اللہ وجہہ کے فرزند نہ تھے بلکہ معاذ اللہ سلمان فارسی کی والا د تھے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

اب کہئے کیا ان اختراعی باتوں کا بھی کوئی اصل صحیح مل سکتا ہے؟ ہر گز نہیں۔ شیعہ علی کرم اللہ وجہہ کے سوا تقریبا کل صحابہ کو دوزخی سمجھتے ہیں، اور علی کرم اللہ وجہہ کو ''قاسم النار والجنة'' کہتے ہیں۔

خوارج حضرت امام حسنؓ کا قول پیش کرتے ہیں کہ ''قراء'' یعنی خوارج، کا قاتل جنت میں نہ جائے گا، اور علی کرم اللہ وجہہ نے بھی تسلیم کر کے تمنا ظاہر کی کہ کاش میں رینگتا ہوا جنت میں داخل ہو جاؤں۔

شیعہ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی خلافت اول سے آخر تک ہے۔ خوارج کہتے ہیں کہ عثمانؓ کے بعد جو آپ خلیفہ ہوئے تھے اس خلافت کو بھی آپ اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھے، کیونکہ

اپنے ہاتھ سے لفظ امیر المؤمنین کو مٹادیا، جس سے لازم آیا کہ وہ امیر الکافرین ہیں۔

''دبستان مذاہب'' میں لکھا ہے کہ خوارج کا اعتقاد ہے کہ ابوبکرؓ وعمرؓ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جس مردہ کو چاہیں زندہ کریں، کسی نے ان سے پوچھا کہ پھر رافضیوں کو گنگے بہرے کیوں نہیں کر دیتے؟ حالانکہ وہ تو سخت بدگوئیاں ان کے حق میں کرتے ہیں کہا: یہ ان کا کمال حلم و برداشت ہے، عمرؓ کے پاس کسی باشادہ نے زہر ہلاہل کا شیشہ بھیجا کہ دشمنوں کے حق میں بکارآمد ہو، آپ نے فرمایا: میرے نفس سے زیادہ کوئی میرا دشمن نہیں، چنانچہ وہ زہر جس کا ایک ایک قطرہ سم قاتل تھا اس کا پورا شیشہ آپ نے پی لیا، اور کچھ اثر نہ ہوا۔ جب ان کی طبیعت میں یہ قوت تھی کہ ایسے زہر کا صدمہ سہ لیا تو دشمنوں کے طعن کا صدمہ سہنا کونسی بڑی بات ہے۔

شیعہ آیت شریفہ ﴿اذ هما في الغار اذ يقول لصاحبه لا تحزن﴾ کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ غار میں چیخ چیخ کر رو رہے تھے، اس غرض سے کہ آنحضرت ﷺ کو کفار کے ہاتھ میں گرفتار کرادیں جیسا کہ رسالہ ''فیض عام'' میں لکھا ہے۔

''تہذیب التہذیب'' میں لکھا ہیکہ حریز بن عثمان جو فن حدیث میں ید طولیٰ رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے علیؓ کو جو فرمایا: ''انت منی بمنزلة هارون من موسى''

سو یہ حدیث تو صحیح ہے مگر بات یہ ہے کہ حضرت نے ''انت منی بمنزلة قارون من موسى'' فرمایا تھا، سننے والوں نے بجائے قارون کے ہارون سمجھ لیا۔ دیکھئے عداوت

کی بھی کچھ انتہا ہے، کہاں قارون اور کہاں ہارون! حضرت ﷺ قارون کے ساتھ آپ کو تشبیہ کیوں دینے لگے مگر دشمنی کا کیا علاج؟ یہ بعینہ ایسا ہے جیسے ''لاتحزن'' کے معنی چیخ چیخ کے رونے کے لئے جاتے ہیں۔

''تہذیب التہذیب'' میں حریز بن عثمان سے روایت کی ہے کہ ایک روز آنحضرت ﷺ نے بغلہ پر سوار ہونے کا ارادہ فرمایا، علیؓ آئے اور کسی تدبیر سے اس کا تنگ ڈھیلا کر دیا تا کہ حضرت گر پڑیں۔

کیا کوئی مسلمان یہ خیال کر سکتا ہے کہ علیؓ کو آپ سے ایسی عداوت تھی؟

شیعہ کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے زکوۃ نہ دینے کی وجہ سے اہل یمامہ سے جہاد کیا اور بارہ سو مسلمانوں کو قتل کیا، جیسا کہ ''منہاج الکرامہ'' میں لکھا ہے۔

خوارج کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے یہ جہاد ایک اسلامی حق کے واسطے کیا تھا، اور علیؓ نے صرف اپنی ریاست اور غلبہ کی غرض سے بغیر حکم خدا اور رسول کے ہزارہا مسلمانوں کو تہ تیغ کیا، حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: ''**سباب المؤمن فسوق و قتاله کفر**'' یعنی مسلمانوں کو گالی دینا فسق ہے اور ان کو قتل کرنا کفر ہے۔ اس وجہ سے نعوذ باللہ وہ کافر ہوگئے۔ اور یہ بھی دلیل پیش کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿**تلک الدار الآخرة نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا و العاقبة للمتقین**﴾ یعنی جو لوگ فساد اور تعلّی نہیں چاہتے ان کے لئے دار آخرت یعنی جنت ہے اور جو فساد اور تعلّی سے قتال کرتے ہیں ان کا حال فرعون کا سا ہے، جو سعادت اخروی سے بے نصیب

ہے۔خوارج کے قتل کا حکم حضرت نبی ﷺ نے دیا تھا، مگر جنگ جمل اور جنگ صفین کا حکم نہ حضرت ﷺ نے دیا نہ قرآن میں مذکور ہے نہ اس پر اجماع ہوا، پھر اگر وہ باغی تھے تو ان کی طرف سے تقدیم ہونی چاہئے تھی، حالانکہ علیؓ نے ان پر فوج کشی کی۔ اس قسم کے اور امور ''منہاج السنہ'' میں مذکور ہیں۔ خوارج کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے۔ اس لئے حضرت علی کی تکفیر کرتے ہیں اور یہاں تک ان کو اس باب میں غلو ہے کہ جب تک کوئی تکفیر نہ کرے، اس کو لڑکی دیں گے نہ اس کی لڑکی کریں گے۔

''ملل ونحل'' صفحہ (۶۹) میں شہرستانی نے لکھا ہے کہ خوارج علیؓ کی تکفیر ہی نہیں کرتے بلکہ نعوذ باللہ ان کے مخلد فی النار ہونے کی بھی تصریح کرتے ہیں۔

ائمہ اہل بیت کو شیعہ معصوم جانتے ہیں۔ اس کے جواب میں بعضوں نے یزید کو حد سے زیادہ بڑھایا چنانچہ ''منہاج السنہ'' صفحہ (۲۳۸) جلد دوم میں لکھا ہے کہ بعض اکراد قائل ہیں کہ یزید صحابی تھا، اور بعض، خلفاء راشدین میں اس کو شمار کرتے ہیں اور بعضوں نے تو اس کو نبی مان لیا ہے۔

''منہاج السنہ'' میں لکھا ہے کہ غُلاۃِ شامیین کا عقیدہ تھا کہ خدائے تعالی جس کو خلیفہ بناتا ہے اس کی کل نیکیاں قبول کرتا ہے اور کل گناہ معاف کر دیتا ہے اور اس سے کسی قسم کی بازپرس نہیں ہوتی۔

اسی وجہ سے معاویہؓ کے لشکر والے جس قدر ان کی اطاعت کرتے تھے اس کا دسواں حصہ علیؓ کے شیعہ آپ کی اطاعت نہیں کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ نے ان کو کئی بار بد

دعائیں دیں۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ائمہ کے معصوم ہونے کا مسئلہ اس وقت ایجاد نہیں ہوا تھا، کیونکہ اگر معصوم مانتے تو اطاعت میں ہرگز تساہل نہ کرتے۔

شیعہ کہتے ہیں کہ کل مسلمان عثمانؓ کے مخالف ہو گئے تھے، اس لئے ان کو قتل کرڈالا، جیسا کہ ''منہاج الکرامہ'' میں لکھا ہے۔

''دبستان مذاہب'' میں امویہ وغیرہ کا قول نقل کیا ہے کہ آیۃ شریفہ ﴿**و من الناس من یعجبک قولہ فی الحیوۃ الدنیا و یشھد اللہ علی مافی قلبہ و ھو الدّالخصام**﴾ الایۃ علیؓ کی شان میں نازل ہوئی۔جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ایسا بھی ہے جس کی باتیں تمہیں اے پیغمبر اچھی معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنے دلی ارادہ پر خدا کو گواہ ٹھیراتا ہے، حالانکہ وہ دشمنوں میں سب سے زیادہ جھگڑالو ہے، کھیتی باڑی اور نسل کو وہ تباہ کرے اور جو اس سے کہا جائے کہ خدا سے ڈر، تو شیخی اس کے دامنگیر ہو کر اس کو گناہ پر آمادہ کرے، ایسے کو جہنم کافی ہے جو بُرا ٹھکانا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ نعوذ باللہ علی کرم اللہ وجہہ حضرت کے مخالف اور مضر دین اور مفسد تمدن تھے۔اسی وجہ سے ان کو لوگوں نے قتل کیا اور ان کے قاتل ابن ملجم کی شان میں وہ آیت نازل ہوئی جو اس آیت موصوفہ سے متصل ہے۔یعنی ﴿**ومن الناس من یشری نفسہ ابتغاء مرضات اللہ**﴾ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے حضرت علیؓ کو جن کا ذکر اوپر کی آیت میں ہے قتل کر کے اپنے نفس کو خرید لیا اور دوزخ سے چھٹکارا پایا اور خدا اس سے راضی ہو گیا۔''**نعوذ باللہ من ھذہ الا عتقادات الفاسدۃ**''۔

شرح مواقف جلد سوم صفحہ (۲۸۷) میں لکھا ہے کہ شیعہ میں ایک فرقہ ہے جس کا نام بیانیہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ آیت شریفہ﴿انا عرضنا الا مانة علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنها و اشفقن منهاو حملها الانسان انه کان ظلوما جهولا ﴾اس میں جو مذکور ہے کہ امانت کو آسمان وزمین نہ اٹھا سکے وہ یہ تھی کہ علی کو خلیفہ ہونے نہ دیں، اس سے آسمان وزمین ڈر گئے کہ علی کا مقابلہ کون کر سکے مگر انسان یعنی ابوبکرؓ نے اس کو اٹھالیا اور اس باب میں عمرؓ نے ان کی مدد کی اس شرط پر کہ اپنے بعد مجھ کو خلیفہ بنائیں۔ سو اس میں ایک بڑا ظالم تھا یعنی ابوبکرؓ اور ایک جاہل تھا یعنی عمرؓ۔ اب کہئے کہ اس قسم کے خرافات جو تراشے گئے ہیں کیا ان کا کوئی اصل نکل سکتا ہے اس قسم کی حدیثیں طرفین سے بنالی گئیں اور آپ نے دیکھ لیا کہ طرفین سے کس قدر افراط وتفریط ہے۔

''منہاج السنہ'' جلد دوم صفحہ (۱۴۵) میں لکھا ہے کہ شیعہ ابوبکرؓ وعمرؓ جانور کے نام رکھ کر ان کو ایذا دیتے ہیں اور سرخ بکری کا نام عائشہؓ رکھ کر اس کے بال اکھاڑتے ہیں، اور لکھا ہے کہ ایک شیعی کے کتے کو کسی نے کبیر کہہ کر پکارا، ہر چند مقصود اس کا ابوبکرؓ کی توہین تھی۔ مگر صاحب کلب کو یہ ناگوار ہوا اور کہا کہ میرے کتے کو دوزخی شخص کے نام سے تو نے کیوں پکارا، اس پر دونوں میں خوب مار پیٹ ہوئی، یہاں تک کہ دونوں زخمی ہوئے۔ اور لکھا ہے کہ آٹے کا پتلا بنا کر اس میں شیرا بھرتے ہیں اور اس کا نام عمرؓ رکھ کر اس کا پیٹ پھوڑتے ہیں اور سب اس کو کھا پی جاتے ہیں، اس تصور سے عمر کا خون پی رہے ہیں اور

گوشت کھا رہے ہیں۔

''دبستان مذاہب'' میں لکھا ہے کہ امویہ عاشورہ کے روز نہایت خوشی کرتے ہیں، یہ عید ان کے یہاں سب عیدوں سے زیادہ ہوتی ہے، اس روز سب جنگل میں جاتے ہیں اور مٹی کے پتلے بنا کر ان کو حضرات شہدائے کربلا کے اجساد تصور کر کے ان پر گھوڑے دوڑاتے ہیں، اس خیال سے کہ، معاذ اللہ، ان حضرات کی لاشوں کو پامال کر رہے ہیں۔ دیکھئے طرفین سے عالم تصور میں کیسی کیسی معرکہ آرائیاں ہو رہی ہیں۔ مگر الحمد اللہ اس تصوری دنیا میں جہاں طرفین جولانی کر رہے ہیں، اہل سنت والجماعت داخل نہیں ہوئے۔ ہر چند کسی کتاب سے اس کا پتہ نہیں چلتا کہ ابتداء اس جنگ دائمی کب سے اور کیونکر ہوئی، مگر میری دانست میں موجد اس کے امویہ اور خوارج ہوں گے۔ اس لئے کہ ان کی طبیعتوں میں عداوت کا سخت جوش ہے۔ چنانچہ دبستان مذاہب میں لکھا ہے کہ ایک گروہ ہے جس کو سیاف کہتے ہیں ان کی عادت ہے کہ تلواریں کھینچ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور آپ کی اولاد امجاد پر، معاذ اللہ، لعنت کرتے ہیں، جس کی وجہ سے لوگ ان کو بہت کچھ دیتے ہیں، چنانچہ اسی پر ان کی گذران ہے اس سے اس قوم کی عداوت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہر وقت وہ اسی خیال میں لگے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی تصوری دنیا میں خاص خاص واقعات کا نقشہ کھینچا رہتا ہے جہاں وہ وقت آ گیا خاکہ جما دیا۔

غرضکہ طرفین سے افراط وتفریط دل کھول کر ہوئی۔ جس قدر حضرات شیعہ صحابہ اور خلفاء پر حملے کرتے ہیں اس سے زیادہ خوارج وغیرہم حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت

کرام رضی اللہ عنہم پر کرتے ہیں اور طرفین کا یہ اصول ٹھرا ہوا ہے کہ جو حدیث اپنے مفید مطلب جس کتاب میں ملے اس کو استدلال میں پیش کرتے ہیں اور جو حدیث وغیرہ اپنے مخالف مدعا ہو اس کو رد کر دیتے ہیں، گو کیسی ہی قوی الاسناد اور صحیح ہو۔ بخلاف اس کے اہل سنت وجماعت کہ ''خیر الامور اوساطھا'' کا شرف ان کو حاصل ہے۔ جو روایتیں فضائل اہل بیت وخلفاء وصحابہ میں طرفین سے پیش ہوتے ہیں سب کو تسلیم کرتے ہیں بشرطیکہ صحیح اور قوی الاسناد ہوں۔ نہ ان کو کسی حدیث کے رد کرنے کی ضرورت ہے نہ تاویل سے غرض، کیوں نہ ہو، جس طرح دین اسلام افراط وتفریط سے بری ہے اسی طرح مذہب اہل سنت والجماعت بھی بری ہے۔

توحید میں افراط وتفریط:

دوسرے ادیان میں افراط وتفریط کا ہونا اور دین اسلام اس سے بری ہونا اس سے ثابت ہے کہ یہود اور نصاریٰ کی توحید میں افراط وتفریط ہے اور دین اسلام میں توسط۔ دیکھئے یہود خدائے تعالیٰ میں صفات نقص بندوں کے ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کو معاذ اللہ فقیر کہتے ہیں، اور ان کا قول ہے کہ خدائے تعالیٰ جب آسمان وزمین کو پیدا کیا تو معاذ اللہ تھک گیا۔ اور نصاریٰ مسیح ابن مریم اور اللہ کے ثالث ثلاثہ ہونے کے قائل اور احبار اور رہبان کے لئے ربوبیت ثابت کرتے ہیں۔ دیکھئے یہود نے خدائے تعالیٰ کو بندوں کے برابر کر دیا اور نصاریٰ نے بندوں کو خدا کے ہمسر بنا دیا بخلاف اہل اسلام کے کہ خدائے تعالیٰ کو تمام نقائص سے منزہ اور بری سمجھتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ مقربان بارگاہ الٰہی

کی عظمت اس حدتک کرتے ہیں کہ شان کبریائی تک نہ پہونچنے پائے۔

مسئلہ ءنبوت میں افراط وتفریط:

اسی طرح مسئلہ نبوت میں بھی افراط وتفریط ہے چنانچہ یہود انبیاء کی توہین کرتے ہیں بلکہ قتل کرڈالتے تھے اور نصاری، حواریوں کو بھی رسول سمجھتے اوران کی اتباع کومثل انبیاء کی اتباع کے بالذات لازم سمجھتے ہیں، بخلاف اہل اسلام کے کہ نبی ﷺ علیہ وسلم کی اطاعت کووہ بالذات ضروری سمجھتے ہیں اور علماء کی اطاعت بھی کرتے ہیں مگراس وجہ سے کہ نبی کریم ﷺ کے احکام کوانہوں نے خوب سمجھا ہے۔تلاش کرنے سے بہت سی نظیریں مل سکتی ہیں کہ دوسرے ادیان میں افراط تفریط ہے اور ہمارا دین متوسط ہے، کیوں نہ ہوحق تعالی فرماتا ہے ’’**وکذلک جعلنکم امة وسطا** ‘‘پھر جس طرح ہمارادین متوسط ہے اسی طرح اہل سنت کا مذہب بھی متوسط اور افراط تفریط سے دور ہے۔

صفات الہیہ میں افراط وتفریط:

دیکھئے صفات الہیہ میں کس قدر افراط وتفریط ہے، معتزلہ تو ان کی بالکل نفی ہی کر دیتے ہیں۔اس وجہ سے کہ قدم خاص صفت الہی ہے، اگر کل صفات بھی قدیم ہوں تو تعدد قدماء لازم آئیگا۔جیسا کہ مواقف وغیرہ میں لکھا ہے اور مجسمہ جتنے آیات واحادیث صفات کے باب میں وارد ہیں سب کو ظاہر پر محمول کرتے ہیں چنانچہ ان کا اعتقاد ہے کہ خدائے تعالیٰ کی صورت ظاہری انسان کی سی ہے، ان کے خدا کا قد سات بالشت کا ہے گوشت وغیرہ سے مرکب دومویہ نورانی تاج اوڑھے عرش پر ٹیکا لگائے بیٹھا ہے، سب اعضاء اس کے

ہلاک ہو جائیں گے مگر چہرہ باقی رہیگا۔ جیسا کہ مواقف اور تلبیس ابلیس اور تمہید میں لکھا ہے۔

مذہب اہلسنت ہی متوسط اور افراط وتفریط سے بری ہے:

دیکھئے کس قدر افراط وتفریط ہے بخلاف ان کے اہل سنت و جماعت خدائے تعالیٰ کے ان تمام صفات کو مانتے ہیں جو قرآن و حدیث میں وارد ہیں مگر اس کے ساتھ یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ جس طرح اس نے فرمایا ہے: ﴿**لیس کمثله شئی وهو السمیع البصیر**﴾ اس کا کوئی کسی بات میں مثل اور شبیہ نہیں نہ اس کی سماعت اعصاب سے متعلق ہے نہ بصارت آنکھ کے پردوں سے کیونکہ ہر صفت موصوف کی شان کے لائق ہوا کرتی ہے جیسے خدائے تعالی جسمانیت اور لوازم جسمانیت سے منزہ ہے اس کے صفات بھی منزہ ہیں۔ چوں کہ ہم لوگ اس قسم کی صفات جسمانیات میں دیکھتے ہیں اس لئے عموماً خیال اسی کی طرف منتقل ہوتا ہے حالانکہ غور کیا جائے تو ان امور کو جسم سے عقلاً کوئی تعلق اور مناسبت نہیں۔ سماعت اور کان کے پٹھے کو خیال کیجئے تو دونوں میں کوئی ذاتی علاقہ نہ سمجھا جائے گا۔ اور ممکن نہیں کہ عقل دونوں میں تعلق ثابت کر سکے، اسی طرح اور صفات کا بھی حال ہے۔ بہر حال مسلمان کا کام یہی ہے کہ خدائے تعالی نے جس طرح اپنے صفات کی خبر دی ہے اس کو اعتقاداً امان لے اور اس کی کیفیات کو علم الٰہی پر حوالہ کر دے اور ہر صفت میں مابلیق بشانہ خیال کیا کرے کیونکہ عقلاء نے بھی تسلیم کر لیا ہے ''**قیاس الغائب علی الشاهد**'' صحیح نہیں۔ غرض کہ اہل سنت و جماعت کا مذہب صفات الٰہیہ میں افراط تفریط سے بری اور

متوسط ہے۔

''مواقف'' میں لکھا ہے کہ شیعہ میں ایک فرقہ ہے جس کو مفوضہ کہتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ حق تعالی نے حضرت محمد ﷺ کو پیدا کر کے تمام دنیا کا پیدا کرنا آپ سے متعلق کر دیا۔

وہابیہ کہتے ہیں کہ محمد ﷺ بھی ہم جیسے ایک معمولی آدمی تھے۔ اہل سنت و جماعت کہتے ہیں کہ بیشک آدمی ہیں مگر تمام آدمیوں سے بلکہ تم عالم سے افضل ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنایا اور علم اولین و آخرین آپ کو عطا ہوا۔ اس کے سوا اور بہت ساری خصوصتیں ہیں جن کو حقانی علماء خوب جانتے ہیں۔

کرامیہ کہتے ہیں خدائے تعالی جس حادث کی طرف ایجاد خلق میں محتاج ہوتا ہے اس کو اپنے میں پیدا کرتا ہے' یعنی ارادہ اور لفظ کن قدرت قدیمہ سے اپنے میں پیدا کرتا ہے، اور یہ حوادث چوں کہ اس میں موجود ہیں اس لئے وہ محل حوادث ہے۔ جبائیہ کہتے ہیں کہ خدائے تعالی کا ارادہ حادث تو ہے مگر محل میں نہیں باوجود یہ کہ خدائے تعالی اس ارادہ کی وجہ سے مرید ہے۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ خدائے تعالی میں صفتِ ارادہ قدیم ہے، البتہ اس کے تعلقات حادث ہیں، اس سے اس ذات منزہ کا محل حوادث ہونا لازم نہیں آتا۔ غرض کہ اہل سنت و جماعت درجہ توسط میں ہیں۔

قضا و قدر اور قدریہ کا مسئلہ ءعدل

''تمہید ابوشکور'' وغیرہ میں قدریہ کا قول لکھا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے بندوں کو ہر کام میں مختار کر دیا ہے جو چاہیں کریں؛ ان کے افعال سے نہ قضاو قدر متعلق ہے، نہ مشیت ایزدی، نہ اس کا ارادہ قدرت، اور اس کو مسئلہء عدل کہتے ہیں۔ اور بعضوں نے تو یہاں تک غلو کیا کہ خدا کو شیطان کا بھی خالق نہیں سمجھتے، اس لئے کہ اس کے پیدا کرنے سے خالق کفر ہونا اور کفر وشر کا ارادہ کرنا لازم آتا ہے۔

انہوں نے فقط اسی کا خیال کرلیا کہ اگر مشیت اور قضا و قدر کے قائل ہو جائیں تو خدائے تعالیٰ کے عدل میں فرق آجائیگا۔ مگر یہ خیال نہیں کیا کہ اگر بندہ کی قدرت مستقل مانی جائے تو لازم آئے گا کہ بندہ کو بھی اتنی قدرت ہے کہ خداے تعالیٰ کے علم ازلی کو باطل کر سکے، کیونکہ اگر علم الٰہی میں مثلاً یہ ہو کہ زید زنا کرے گا اور اس کے نطفہ سے بچہ پیدا کیا جائے گا تو اگر زید میں اتنی قدرت ہو کہ زنا کو ترک کر دے تو خدائے تعالیٰ کا علم خلاف واقع ثابت ہوگا۔ اور لازم آئے گا کہ بندہ نے اپنی قدرت سے علم الٰہی کو باطل اور خلاف واقع ثابت کر دیا۔ اور اگر زنا کو ترک کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کی قدرت مستقل کہنا ہی فضول ہے۔ رہا عدل سو وہ مالک و مختار ہے، اپنی ملک میں جو چاہے کرے، کوئی اس سے پوچھ نہیں سکتا، جیسا کہ خود ارشاد فرماتا ہے: ﴿**لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون**﴾ یعنی وہ جو کام کرتا ہے اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا اور وہ سب سے پوچھے گا۔ دیکھئے جس کو چاہا دنیا میں شقی بنایا اور جس کو چاہا سعید، فقیر جو فاقوں سے مر رہا ہو وہ یہ نہیں پوچھ سکتا کہ میرے بھائی کو بادشاہ اور امیر اور مجھے فقیر کیوں بنایا کیونکہ تخلیق سے متعلق کوئی سوال خالق سے نہیں ہوسکتا

اس طرح سعادت اخروی سے متعلق بھی سوال نہیں ہوسکتا اس لئے کہ ان کا مدار بھی انہیں صفات پر ہے جو مخلوق الٰہی ہیں دیکھئے سخاوت، شجاعت، عفت وغیرہ سب فطرتی امور ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کوئی سخی ہے تو کوئی بخیل اور کوئی بزدل ہے تو کوئی جوان مرد کوئی شہوت پرست ہے تو کوئی متقی، ہر صفت کے آثار وہی ظہور میں آئیں گے جو اس سے متعلق ہیں۔ اب کہئے کیا کوئی پوچھ سکتا ہے کہ مجھے بخیل کیوں بنایا اگر سخی بناتا تو میں سعادت حاصل کرتا اسی پر سب کو قیاس کر لیجئے۔ اس سے ثابت ہے جس کو چاہا جنتی بنایا اور جس کو دوزخی جیسا کہ ارشاد ہے﴿و لقد ذرأنا لجھنم کثیرا من الجن و الانس ﴾یعنی ہم نے بہت سے جن وانس کو دوزخ کے واسطے پیدا کیا ہے۔ جب کفار کی تخلیق سے متعلق سوال کر سکے، اگر سوال وجواب کا دروازہ کھولا جائے تو بڑی دشواری ہے۔ ابوالحسن اشعریؒ نے جبائی سے پوچھا جو معتزلی تھا کہ فرض کرو کہ خدائے تعالی نے تین شخصوں کو پیدا کیا، اس میں سے ایک لڑکپن میں مر گیا اور دو بالغ ہوئے ان میں ایک جنتی ہوا اور ایک دوزخی۔ پھر لڑکپن میں جو مر گیا تھا وہ جنت میں داخل کیا گیا۔ مگر اس کے بھائی کے درجہ سے اس کو کم درجہ ملا۔ اب وہ لڑکا پوچھتا ہے کہ مجھ سے کیا قصور ہوا کہ اپنے بھائی کے درجہ سے میں کم درجہ ہوں، ارشاد ہوا کہ اس نے عمل کیا تھا اور تو نے کچھ عمل نہیں کیا، اس نے عرض کی کہ اگر میں بھی اس کی عمر پاتا تو بہت کچھ عمل کرتا ارشاد ہوا کہ اس میں ایک مصلحت تھی، وہ یہ کہ میں جان لیا تھا کہ اگر تو بالغ ہوتا تو کافر ہو جاتا اس لئے تجھے لڑکپن ہی میں ہم نے دنیا سے اٹھا لیا جو تیرے حق میں اصلح تھا۔ یہ سنتے ہی دوزخی نے فریاد کی الٰہی اگر مجھے بھی میرے بھائی کی طرح قبل از بلوغ

مار ڈالتا تو میرے حق میں بری مصلحت تھی، نہ میں زندہ رہتا نہ کافر، نہ دوزخی بنتا۔اب اس کافر کا کیا جواب غرض جبائی سے اس کا جواب کچھ نہ ہوسکا، اور مبہوت ہوگیا۔

بات یہ ہے کہ خدائے تعالی کو کوئی ضرورت نہیں کہ مصالح جزئیہ کے لحاظ سے ہر ایک کی مرضی کے موافق کام کیا کرے، وہاں تو مصالح کلیہ ملحوظ ہیں۔شان کبریای کے شایاں نہیں کہ ہر کام کی مصلحت ہر ایک سے بیان کرتا ہے یا اس کی مرضی کے موافق کام کیا کرے۔اس میں شبہ نہیں کہ خدائے تعالی کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں، کیوں کہ یہ مقولہ ''**فعل الحکیم الا یخلو عن الحکمة**'' ہر قوم کا مسلمہ ہے، جب معمولی حکیموں کا فعل مصلحت سے خالی نہ ہو تو خالق حکماء وحکمت کے افعال کیونکر خالی ہوسکیں گے، مگر یہ ضرور نہیں کہ ہر فعل کے کل مصالح ہم سمجھ سکیں۔دیکھئے حکماء کے کاموں کو بھی تو سب مصلحتیں اور حکمتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔پھر خدائے تعالی کے عمومی مصالح کیونکر سمجھ میں آسکیں، اگر یہی بات ہوتی تو سائنس کی ترقی ممکن نہ ہوتی۔حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مخلوقات میں جو جو حکمتیں اور مصلحتیں ودیعت کی گئی ہیں یوماً فیوماً گویا الہامی طریقوں میں معلوم کرائی جارہی ہیں۔غرض کہ خدائے تعالی نے جسے چاہا دوزخ کے لئے پیدا کیا اور اس میں وہی افعال پیدا کئے جن کی سزا دوزخ ہے اور جسے چاہا جنتی بنایا اور اس میں افعال حسنہ پیدا کئے۔﴿**بفعل اللہ مایشاء و یحکم مایرید**﴾ پھر تقدیر کو ہر ایک شخص سے مخفی رکھا اور بذریعہ انبیاء سب کو معلوم کرادیا کہ کونسے افعال باعث دخول دوزخ ہیں اور کون سے باعث دخول جنت اور ہر شخص کو اچھے برے کی تمیز دی۔چنانچہ وہ جان بوجھ کر اچھے برے کاموں کا ارادہ کرلیتا

ہے اوراس کے ارادہ کے مطابق خدائے تعالی وہ کام اس میں پیدا کر دیتا ہے۔اب یہ کہنا کہ خدا کا ظلم ہے کہ ایسی چیز پیدا کرتا ہے جو باعث ہلاکت ہے تو اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی کہے: خدا زہر کو پیدا کر کے لوگوں کو ہلاک کرتا ہے، اس لئے وہ ظالم ہے۔ یہ الزام ہرگز عائد نہیں ہوسکتا اس لئے کہ خدائے تعالیٰ نے زہر اور افعال سیئہ کی خاصیتیں پہلے ہی معلوم کرادیں جس سے ہر شخص جانتا ہے کہ جوان کا استعمال کرے گا ہلاک ہوگا۔اب رہا امر تقدیری سووہ راز سر بستہ ہے کسی کو خبر نہیں دی گئی کہ اس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے۔

فتوحات مکیہ میں لکھا ہے کہ ابلیس سے خدائے تعالیٰ نے پوچھا کہ تو نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ کہا اگر تیرا ارادہ ہوتا تو میں ضرور سجدہ کرتا، ارشاد ہوا کہ تجھے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ ہمارا ارادہ نہیں، کہا نہیں، اسی وجہ سے تو قابل مواخدہ ہے ہر چند فعل کی تخلیق میں بندے کی قدرت کو کوئی دخل نہیں اس لئے کہ اس کا فعل ممکن اور حادث ہے اور کوئی ممکن حادث بغیر خدا کے پیدا کئے پیدا نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ وجود دنیا خاص خدا کا کام ہے جب خود بندہ اپنے وجود میں خدائے تعالیٰ کا محتاج ہے تو یہ تو اس کے عوارض اور حالات ہیں، مگر اتنا ضرور ہے کہ جب تک بندے کا ارادہ نہ ہو خدائے تعالی اس کام کو پیدا نہیں کرتا۔ بہر حال بندے کا ارادہ فعل سے متعلق ہونا اس کو کاسب کہنے کے لئے کافی ہے، اور وہ اس وجہ سے اپنے کو کاسب بلکہ فاعل مختار سمجھتا ہے اور اپنے وجدان میں رعشہ کی حرکت اور اختیاری حرکت میں فرق کرتا ہے سمجھنے کے لے من وجہ یہ مثال کافی ہوسکتی ہے اگر توپ میں مثلاً بار ہو اور کسی سوتے ہوئے شخص کی طرف اس کا منہ ہو اور ایک شخص اس

کے قتل کی غرض سے توپ کے کان پر آتشی آئینہ نصب کر کے چلا جائے اور جب آفتاب محاذی ہو اور آواز چل جائے تو یہ شخص اپنی براءت کے واسطے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے صرف اس کے قتل کا ارادہ کیا تھا پھر آفتاب کا حرکت کر کے نصف النہار تک پہنچنا اور باروت کے محاذی ہونا اور سیدھی سیدھی شعاعوں کا اس پر گرنا اور اس سے آگ کا پیدا ہونا میرے اختیار سے خارج ہے، اور تو اور خود اس کا وجدان گواہی دیگا کہ گو باعث قتل کچھ ہی ہو مگر وہ ارادہ اور ہاتھ سے آئینہ کو نصب کرنا خود اقدام قتل ہے گو یا بارود میں آگ کا پیدا ہو جانا آفتاب کا اثر ہے۔ اسی طرح گو ایجاد فعل خدا کی قدرت کا اثر ہے مگر آدمی کا ارادہ اور مباشرت جوارح اس کو مجرم بنانے کے لئے کافی ہیں۔ جب ایمانی اور عقلی طریقہ سے ثابت ہو گیا کہ ایجاد فعل میں بندے کو دخل نہیں وہ صرف خدا کا کام ہے، تو اس کے بعد بندے کو اس فعل پر قادر اور اس کے لئے قدرت حقیقی یا وہی ثابت کرنا کسی قدر ضرورت سے زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ رہا الزام سو اس کے لئے تعلق ارادہ اور وجدان عادی کافی ہے، کیونکہ وجدان کیلئے یہ ضرور نہیں کہ ہمیشہ وہ واقعی امر کی خبر دیتا ہو۔ دیکھئے احوال کا وجدان یہی گواہی دے گا کہ ایک کے معنی دو ہیں، صفراوی امراض والے کا وجدان یہی گواہی دے گا کہ شکر کڑوی ہے، بارش کے قطروں کو دیکھنے والے کا وجدان یہی گواہی دیتا ہے کہ پانی کی دھاریں زمین پر گرتی ہیں، اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ واقعہ کچھ ہے اور وجدان کچھ گواہی دیتا ہے۔

جب وجدان کا قابل اعتبار نہ ہونا صدہا مثالوں سے ثابت ہے تو صرف اس

وجدان سے (کہ اپنے فعل کے خالق ہم ہیں یا ہماری قوت، اس کی خالق یا اس میں موثر ہے) نصوص قطعیہ کو ترک کر دینا کوینکر جائز ہوگا۔ جتنے بت پرست ہیں ان کا وجدان گواہی دیتا ہے کہ ان کی مرادیں بتوں سے حاصل ہوتی ہیں اور وہ حاجت روا ہیں، جس کی وجہ سے وہ بتوں کو خدا کے شریک ٹھہراتے ہیں۔ اگر ہم بھی اپنے وجدان کی وجہ سے اپنے آپ کو اپنے افعال کے خالق قرار دیں تو ہم میں اور ان میں فرق ہی کیا ہوا۔ نعوذ باللہ ہم بھی خالق ٹھہرے۔ اسی وجہ سے قدریہ کو آنحضرت ﷺ نے "مجوس هذه الامة" فرمایا ہے کیونکہ مجوس دو خالق کے قائل ہیں، ایک خالق خیر دوسرا خالق شر۔ اگر اس مجوسانہ اعتقاد پر خدائے تعالی مواخدہ فرمائے تو کچھ بعید نہیں بلکہ عدل ہوگا، اس لئے کہ افعال سیئہ پر عقوبت کرنا اسی وجہ سے ہے کہ خدائے تعالی کے امر و نہی کی اس میں مخالفت ہوتی ہے، سو وہ اس میں بھی موجود ہے۔ دیکھئے خدائے تعالی فرماتا ہے: ﴿والله خلقكم وما تعملون والله خالق كل شئى﴾ اس کے سوا صدہا آیات واحادیث وارد ہیں جن سے صاف ظاہر ہے کہ ہر معدوم کو موجود کرنا خدا ہی کا کام ہے۔ اب عقل کو ماننے میں اگر عذر ہے تو اسی قدر ہے کہ اگر تخلیق افعال کو خدا اپنے قبضہ میں رکھ کر کسی کام کا حکم کرے تو عدل کے خلاف ہوگا، مگر عقل اس کو بھی تو جائز نہیں رکھتی کہ خدائے تعالیٰ کا کلام خلاف واقع ہو اور خالق کا کلام باوجود تصدیق کرنے کے جھوٹا تصور کیا جائے، کیونکہ تاویل کرنے کا مطلب کھلے لفظوں میں یہی ہے کہ ہم اس کو نہ مانیں گے۔ اور اپنی عقل کے مطابق اس کو بنالیں گے پھر یہ بھی خلاف عقل ہے کہ بندے میں اتنی قدرت فرض کی جائے کہ خدائے تعالی کے علم ازلی کو

خلاف واقع ثابت کر سکے۔ صورت سابقہ میں اگر عدل میں کلام تھا تو اب خالقیت وغیرہ میں کلام ہوگیا، ایسے موقع میں اہل ایمان کو چاہئے کہ جس طرح ممکن ہو خدائے تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کو تسلیم کرلیں اور اس کے سمجھنے کی فکر میں لگے رہیں اور کوشش کریں تو امید ہے کہ چند روز کی کوشش میں وہ بات خود حل ہو جائے گی کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے ﴿والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا ﴾ اس سچے وعدے کا مقتضاء یہ ضرور ہے کہ اس کے لم کو خدائے تعالی ضرور سمجھا دے گا یہی وجہ ہے کہ اہل سنت و جماعت کو اس مسئلہ میں جتنے آیات ظاہرہ متعارض معلوم ہوتے ہیں ان میں بفضلہٖ تعالی ذرا بھی تردد نہیں، سب پر برابر ایمان لاتے ہیں اور ان کے اثبات پر دلائل قائم کرتے ہیں مگر یہ یاد رہے کہ سمجھنے کی کوشش میں نیک نیتی کریں اور عقیدت ملحوظ رہے، ورنہ قیامت تک وہ بات ہرگز سمجھ میں نہ آئے گی۔ کیونکہ خدائے تعالیٰ کو کیا غرض کہ انکار پر اڑے ہوؤں کی تفہیم کرے۔ دیکھئے صاف ارشاد ہے ﴿نولہ ماتولی ونصلہ جھنم ﴾ نبی کریم ﷺ کمال خیرخواہی سے منکروں کو سمجھانے کی کوشش ضرورت سے زیادہ فرماتے تھے، اس پر ارشاد ہوا: ﴿افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین و ماکان لنفس ان تومن الا باذن اللہ ویجعل الرجس علی الذین الا یعفلون ﴾ یعنی کیا تم اے پیغمبر ﷺ لوگوں پر زبردستی کرتے ہو کہ خواہ مخواہ وہ ایمان لائیں، بے حکم خدا کسی شخص کے اختیار میں نہیں کہ ایمان لے آئے، اور خدا کفر کی گندگی ان پر ڈالتا ہے جو سمجھتے نہیں انتھی۔

مقصود یہ کہ آپ کو اس قدر رنج اٹھانے کی ضرورت نہیں آپ کا کام کہہ دینا ہے

جس کا جی چاہے مانے جس کا جی چاہے نہ مانے۔شعر

در فیض محمد وا ہے آئے جس کا جی چاہے

نہ آئے شوق سے دوزخ میں جائے جس کا جی چاہے

قدریہ کی عقلوں نے خدائے تعالی کوظلم سے بری کرنے کی غرض سے یہ تدبیر نکالی کہ وہ خالق افعال نہیں اور کہدیا کہ عالم کے ایک بڑے حصہ کا خالق نہ ہوتو کچھ مضائقہ نہیں۔دوسرے عقلاء نے کہا کہ مادّے سے سب کام چل جاتے ہیں اس لئے پورے عالم کا بھی وہ خالق نہ ہوتو کیا مضائقہ۔چنانچہ مولوی شبلی صاحب نے ''منہاج الکرامہ'' میں لکھا ہے کہ اکثر اہل سنت اس بات کے قائل ہیں کہ حق تعالیٰ قبیح کام کرتا ہے اور کفر اور کل معاصی قضاء وقدر سے واقع ہوتے ہیں جن میں بندے کے فعل کو دخل کچھ نہیں،اور خدائے تعالی کافر سے معصیتوں کا ارادہ کرتا ہے اوراس کی اطاعت کا ارادہ نہیں کرتا۔اس سے لازم آتا ہے کہ خدا تعالی ظالم ہو کہ خود ہی نے کفر کو اس کی تقدیر میں رکھا اور ایمان کی قدرت اس میں نہیں پیدا کی،اور باوجود اس کے اس پر عذاب کرے گا جس سے کافروں کو حجت قائم کرنے کا موقع مل جائے گا۔اور انبیاء کی بعثت نہ ہوگی۔اور انبیاء پر وہ حجت قائم کردیں گے کہ خدا نے ہم میں ایمان کی قدرت ہی نہیں پیدا کی۔پھر ہم ایمان لائیں تو کیسے اور نیز کافر کو ایمان کا حکم کرنا تکلیف مالا یطاق ہوگا،اور ہمارے اختیاری افعال اضطراری ٹھیر جائیں گے،اور جب سب فعل خدا کے ہوں تو محسن اور مخالف میں فرق کرنے کی ضرورت کیا؟اور کافر مطیع سمجھا جائے گا،اس لئے کہ اس نے ارادہ الٰہی کی تکمیل کی اور خدا کی طرف

سفاہت کی نسبت لازم آئے گی کہ کافرکو ایمان کا حکم کرتا ہے، اور اس کا ارادہ نہیں کرتا: ’’نعوذ باللہ منہا ‘‘ان کے سواء اور بہت سے اعتراض کئے ہیں جو تقدیر کے مسئلہ پر وارد ہوتے ہیں۔

یہ بات واضح رہے کہ مسئلہ تقدیر میں گفتگو کرنے کا حکم نہیں، آنحضرت ﷺ اس مسئلہ میں گفتگو کرنے والوں پر خفاء ہوا کرتے تھے۔

نہج البلاغہ صفحہ (۱۲۶) میں حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے: ’’**وسئل عن القدر فقال طریق مظلم فلا نسلکوہ و بحر عمیق فلا تلجوہ و سر اللہ فلا تتکلفوہ** ‘‘یعنی کسی نے علی کرم اللہ وجہہ سے قدر کا مسئلہ پوچھا، فرمایا: وہ اندھری راہ ہے اس میں مت چلو اور عمیق سمندر ہے اس میں مت داخل ہو وہ خدا کا بھید ہے اس کے سمجھنے کی تکلیف مت اٹھاؤ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ ہر ایک کی سمجھ میں پورے طور سے نہیں آسکتا مگر چوں کہ حضرات شیعہ مسئلہ عدل پر بہت زور دیتے ہیں، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ تھوڑی سی بحث اس میں بھی کرلی جائے۔

خلق خیر وشر:

کلینی کے باب الخیر والشر میں یہ حدیث منقول ہے: ’’**عن محمد بن مسلم قال سمعت ابا جعفر بقول ان فی بعض ما انزل اللہ من کتبہ انی انا اللہ لا آلہ الا انا خلقت الخیر و خلقت الشر فطوبی لمن اجریت علی یدیہ الخیر و ویل لمن اجریت علی یدیہ الشر و ویل لمن یقول کیف ذا و**

کیف ذا‘‘۔یعنی امام ابوجعفر (محمد باقرؑ) فرماتے ہیں کہ کسی کتاب آسمانی میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں میں نے خیر وشر دونوں پیدا کئے، اس کو خوشخبری ہے جس کے ہاتھوں پر میں نے خیر جاری کی اور اس کی خرابی ہے جس کے ہاتھوں پر میں نے شر جاری کی اور اس کی بھی خرابی ہے جو کہے یہ کیسا اور وہ کیوں کرانتہی۔

دیکھئے لفظ ’’ویل‘‘ اس کی نسبت ارشاد ہے جو اس مسئلہ میں استبعاد ظاہر کرے جس کا مقتضا یہ ہے کہ آدمی کو چاہئے کہ بغیر چوں و چرا کے اس مسئلہ کو تسلیم کرے۔

جبر وقدر اور اختیار:

اور اسی کے باب الجبر والقدر صفحہ (۸۹) میں یہ روایت ہے ’’عن ابی عبداللهؑ قال لا جبر و لا تفویض ولکن الامر بین الامرین ‘‘یعنی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ نہ جبر ہے نہ تفویض بلکہ معاملہ دونوں کے بین بین ہے۔

بندہ مجبور نہ ہونے کی توضیح اس روایت سے ہوتی ہے جو کلینی کے اسی صفحہ (۸۹) میں ہے کہ جنگ صفین کے بعد جب امیر المومنینؑ کوفہ کو واپس تشریف لائے، ایک پیرمرد نے پوچھا حضرت ہم جو اہل شام کی طرف گئے تھے کیا وہ قضا وقدر کی وجہ سے تھا فرمایا: ہاں جہاں جہاں تم گئے وہ قضا وقدر ہی سے تھا۔شیخ نے کہا: خیر مجھے اس رنج وسختی پر ثواب کی امید ہے۔فرمایا اے شیخ تمہارے چلنے اور مقام کرنے اور لوٹنے میں برابر ثواب ہوتا رہا کیونکہ تم ان امور میں مکرہ ومضطر نہ تھے۔اس نے کہا: جب قضا وقدر سے وہ سب کام ہو رہے تھے تو ہمارے مضطر ہونے میں کیا کلام؟ فرمایا: کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ قضا حتمی اور قدر لازم تھی؟ اگر

ایسا ہوتا تو ثواب وعقاب وامرونہی وغیرہ سب باطل ہو جاتے۔ ایسا نہیں، خدائے تعالی نے اختیار بھی دیا ہے انتہی ملخصا۔

مطلب یہ کہ جس طرح پیاسا مضطر ہوکر پانی کی طرف جاتا ہے، یا اکراہ کے وقت کسی کی زبردستی سے آدمی کوئی کام کرتا ہے قضا وقدر سے کام ہونا ایسا نہیں ہے، بلکہ آدمی اپنے میں اختیار کی کیفیت پاتا ہے، اور اپنے آپ کو مختار سمجھ کر کام کرتا ہے، جس پر ثواب و عقاب کا مدار ہے۔ اور جو فرمایا کہ ''تفویض بھی نہیں''۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدائے تعالی نے بندوں کے اختیاری افعال کو ان ہی کے اختیار پر نہیں چھوڑ دیا، اسطور سے کہ خدائے تعالیٰ چاہے یا نہ چاہے وہ اپنے اختیار سے جو چاہیں کرلیں۔

ارادۂ الٰہی پورا ہوتا ہے:

چنانچہ کلینی صفحہ ۹۱ میں یہ روایت ہے۔ ''عن ابی جعفر و ابی عبدالله قال ان الله ارحم بخلقه من ان یجبر خلقه علی الذنوب ثم یعذبهم علیها و الله اعز من ان یرید امرا فلا یکون'' یعنی خدائے تعالی کا یہ مقتضائے رحم نہیں کہ بندوں سے جبراً گناہ کرائے اور ان پر عذاب کرے، اور اس کی شان وعزت اس سے برتر ہے کہ کسی اچھے یا برے کام کا ارادہ کرے اور وہ وجود میں نہ آئے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدائے تعالی کا ارادہ ہوتا ہے کہ بندے سے کوئی برا کام مثلا وجود میں آئے تو ممکن نہیں کہ وہ وجود میں نہ آئے۔

کام کرنا یا چھوڑنا بغیر اجازت الٰہی کے ممکن نہیں:

اور کلینی صفحہ ۹۱ میں یہ روایت ہے: ’’عن ابی عبداللہ قال ان اللہ خلق الخلق فعلم ماھم صائرون الیہ و امرھم و نھاھم فما امرھم بہ من شئی فقد جعل لھم السبیل الی ترکہ ولا یکونون آخذین ولا تارکین الا باذن اللہ ‘‘یعنی خدائے تعالی نے جو خلق کو پیدا کیا تو وہ جانتا تھا کہ کون کہاں جانے والا ہے اور ان کو امر و نہی کیا جس کام کا ان کو امر کیا اس کے ترک کرنے کا بھی طریقہ ٹھیرا دیا، اچھے برے کام کرنا یا چھوڑنا بغیر اجازت الٰہی کے نہیں ہوسکتا۔ انتہی۔

مطلب یہ کہ دنیا میں بغیر اذن الٰہی کے نہ کوئی کام وجود میں آسکتا ہے نہ کوئی کام ترک کیا جاسکتا ہے۔ اور کلینی صفحہ ۹۱ میں یہ روایت بھی ہے: ’’عن ابی عبداللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من زعم ان اللہ یأمر بالسوء و الفحشاء فقد کذب علی اللہ و من زعم ان الخیر و الشر بغیر مشیۃ اللہ فقد اخرج اللہ من سلطانہ و من زعم ان المعاصی بغیر قوۃ اللہ فقد کذب علی اللہ و من کذب علی اللہ ادخلہ اللہ النار ‘‘یعنی جو کوئی کہے کہ خدائے تعالی برے کام اور بے حیائی کا حکم کرتا ہے، اس نے خدا پر جھوٹ کہا اور جو کہے کہ خیر و شر بغیر مشیت الٰہی کے وجود میں آتے ہیں اس نے خدا کو اس کی سلطنت سے نکال دیا۔ اور جس نے یہ کہا کہ معصیتیں بغیر قوت الٰہی کے ہوتی ہیں اس نے خدا پر جھوٹ کہا اور جس نے خدا پر جھوٹ کہا خدا اس کو دوزخ میں ڈالے گا۔ انتہی۔

اس سے ظاہر ہے کہ خدائے تعالی نے اگرچہ بندے کو اختیار دیا ہے مگر دراصل وہ

اپنے اختیار سے وہی کام کرتا ہے جو مشیت الٰہی میں ہو، جس کا مطلب یہ ہوا کہ خدائے تعالی کی مشیت کے میں بندہ اپنے اختیار سے کوئی نفع نہیں اٹھا سکتا۔ خواہ اچھا کام ہو یا برا پہلے مشیت الٰہی میں اس کا وجود ہوتا ہے یعنی جب تک خدائے تعالی نہ چاہے کوئی کچھ کام نہیں کرسکتا۔ اور ہر کام کے وقت اذن ہوتا ہے کہ وہ وجود میں آئے، ورنہ ممکن نہیں کہ وجود میں آسکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بندے کو اختیار دیا گیا ہے مگر اس سے جو کام وجود میں آتے ہیں وہی ہوتے ہیں جو خدائے تعالی نے اس کے لئے مقرر فرمائے ہیں، مثلاً وہ مسلمان ہوگا یا کافر وغیرہ وغیرہ۔

اگر بندہ ولی بننا چاہے اور خدائے تعالی چاہے کہ وہ شیطان بنے تو وہ شیطان ہی بنے گا، مگر کس لطف کے ساتھ کہ اپنے اختیار اور طاقت اور قدرت پر فخر و ناز کرتا ہوا۔ کیوں نہ ہو جس طرح خدائے تعالی نے متضاد چیزیں پیدا کی ہیں، کوئی گرم کوئی سرد کوئی ثقیل کوئی خفیف اسی طرح کسی کو اچھا کسی کو برا کسی کو جنتی کسی کو دوزخی پیدا کیا۔

اور کلینی صفحہ (۸۷) میں یہ روایت ہے: ''**عن ابی عبداللہ انہ قال لا یکون شیئی فی الارض ولا فی السماء الا بھذہ الخصال السبع: بمشیۃ وارادۃ و قدر و قضاء و اذن و کتاب و اجل فمن زعم انہ یقدر علی نقض و احد فقد کفر۔**

یعنی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ زمین وآسمان میں جو چیز وجود میں آتی ہے سات چیزیں اس میں ضرور ہوں گی: پہلی خدائے تعالی کی مشیت اس سے

متعقل ہوتی ہے پھرارادہ اوراس کا اندازہ کہ وہ کیسی ہوگی: پھر فیصلہ ہوجاتا ہے کہ اس طرح ہو پھراس کے وجود کے وقت اذن ملتا ہے کہ وجود میں آئے اورلکھا جاتا ہے کہ کتنی دیر وہ اس عالم میں رہے۔اس کے بعد فرماتے ہیں کہ جوشخص خیال کرے کہ ہم اس میں سے کسی ایک چیزکوتوڑسکتے ہیں تو وہ کافر ہے انتہی۔

دیکھئے یہ ساتوں چیزیں ہرکام سے برابر متعلق ہوتی ہیں، بغیر مشیت وارادے کے توفعل ہوتا ہی نہیں، پھر ہر فعل کا اندازہ بھی مقرر رہے، مثلاً نماز کتنی دیر میں پڑھیں گے اور روزہ اتنی مدت تک رکھا جائے گا۔علی ہذاالقیاس قضاء وقدروغیرہ۔اب اگرکوئی کہے کہ ان میں سے کس چیزکو ہم توڑسکتے ہیں مثلاً خدا کی مشیت میں گناہ کرنا ہمراہوبھی تو ہم نہ کریں گےتو حسب حدیث موصوف وہ کافر ہے غرض کہ جوفعل وجود میں آتا ہے وہ خدائے تعالیٰ کی مشیت، ارادہ، تضاء وقدراوراذن سے وجود میں آتا ہےاورابھی معلوم ہوا کہ گناہ بھی قوت الٰہی سے وجود میں آتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ خدائے تعالیٰ خیر وشر کو بندے کے ہاتھوں پرجاری کردیتا ہے۔اب کہئے جس فعل کوخدائے تعالی بندے کے ہاتھ پر جاری کرتا ہے وہ فعل خدا کا مخلوق ہوگا، یا بندے کا؟ اس سے تو ظاہر ہے کہ جس طرح آسمان وزمین جن سے متعلق وہ سات چیزیں ہیں ایک مستقل مخلوق الٰہی ہیں، اسی طرح ہمارے افعال بھی مستقل مخلوق الٰہی ہیں، جن سے ان ساتوں چیزوں کا تعلق ہے۔فرق ہے تو صرف اتنا کہ وہ جواہر ہیں اور ہمارے افعال ہم میں بطوراعراض مثل رنگ وبووغیرہ کے موجود ہوتے ہیں۔اب اگرسمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے کوئی کہے کہ یہ کیوں کر ہوسکتا ہے تو حضرت امام

جعفر نے اس کی نسبت خدائے تعالی کا کلام نقل فرمادیا ’’ویل لمن یقول کیف ذا و کیف ذا ‘‘ مگر اتنا ضرور ہے کہ اچھی چیزوں کی نسبت خدائے تعالیٰ کی طرف کی جائے اور برے چیزوں کی نسبت اپنی طرف، جیسا کہ کلینی صفحہ ۹۰ میں یہ روایت ہے ’’عن الحسن بن علی الوشا عن ابی الحسن الرضی قال سألته فقلت: الله فوض الامر الی العباد قال: الله اعز من ذلک قلت فجبر هم علی المعاصی قال الله اعدل و احکم من ذلک قلت ثم مه قال: قال الله تعالی یا ابن آدم انا اولی بحسناتک منک و انت اولی بسیئاتک منی عملت المعاصی بقوتی التی جعلتها فیک‘‘۔

یعنی حسن بن علی نے ابوالحسن رضا علیہ السلام سے پوچھا کیا خدا نے بندوں کے کام ان ہی کے تفویض فرمادیئے؟ کہا: خدا کی عزت اس سے زیادہ ہے (کہ اس کے ملک میں کوئی خودمختار ہوسکے) کہا: تو کیا گناہوں پر ان کو مجبور کیا؟ فرمایا کہ خدا کا عدل اس کو مقتضی نہیں، کہا: پھر کیا ہے؟ فرمایا کہ خدائے تعالی کا ارشاد ہے کہ اے بندے بہتر یہ ہے کہ اپنے حسنات کی نسبت میری طرف کر اور سیئات کی نسبت اپنی طرف، تو نے گناہ میری قوت سے کیا جو میں نے تجھ میں رکھی تھی انتہی ۔شعر۔

تو نیکی کنی من نہ بد کردہ ام   کہ بدر راحوالت بخود کردہ ام

اب جو قوت آدمی میں رکھی گئی اس کا بھی حال سن لیجئے۔ اور کلینی صفحہ (۹۳) میں یہ روایت بھی ہے: ’’عن رجل من اهل البصرة قال سألت ابا عبدالله عن

الاستطاعة فقال ابو عبدالله اتستطيع ان تعمل مالم يكتون قال لا قال فتستطيع قال لا ادری فقال له ابو عبدالله ان الله خلق خلقاً فجعل فيهم آلة الا ستطاعة ثم يفوض اليهم فهم مستطيعون بالفعل وقت الفعل مع الفعل اذا فعلوا ذلک الفعل فاذا لم يفعلوه فی ملکه لم يکونوا مستطيعين ان يفعلوا فعلاً لم يفعلوه لان الله عز وجل اعز من ان يضاده فی ملکه احد. قال البصری فالناس مجبورون قال لو کانوا مجبورين کانوا معذورين قال ففوض اليهم قال لا قال فما هم قال علم منهم فعلا فجعل فيهم آلة الفعل فاذا فعلوا کانوا مع الفعل مستطيعين قال البصری اشهد انه الحق و انکم اهل بيت النبوة و الرسالة''۔

یعنی ایک بصرے والے شخص سے روایت ہے، وہ کہتا ہے کہ میں نے ابوعبداللہؑ سے پوچھا کہ آدمی میں کام کرنے کی جوقدرت واستطاعت ہے اس کی کیا صورت ہے؟ فرمایا: کیا تجھ سے ہوسکتا ہے کہ ایسا کام کرے جس کوخدا نہ پیدا کرے؟ کہا: نہیں، فرمایا: کیا تجھ سے یہ ہوسکتا ہے کہ ایسے کام سے باز رہے جس کوخدا پیدا کردے کہا: نہیں، فرمایا: پھر تجھ میں استطاعت کب ہوگی؟ کہا: میں نہیں جانتا۔ فرمایا: خدائے تعالی نے جب خلقت پیدا کی تو ان میں استطاعت کا آلہ رکھا مثلاً ہاتھ، پاؤں وغیرہ۔ پھر باوجود یکہ یہ آلہء استطاعت دیا مگر کام ان کے تفویض نہیں کیا۔ پھر جب لوگ کوئی کام کرتے ہیں تو اس کے کرنے کے وقت ان کو استطاعت اور طاقت ہوتی ہے۔ جب تک وہ اس کام کو کرتے

ہیں۔اور باوجود آلہ کے وہ کام خدا کی ملک میں نہ کریں تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس کام کے کرنے کی ان میں استطاعت اور قوت ہی نہ تھی، اس لئے کہ جب بحسب مشیت وارادہ الٰہی ان سے وہ کام نہ ہوا، اور باوجود اس کے سمجھا جائے کہ ان میں اس کی استطاعت تھی تو لازم آئے گا کہ خدا کی ملک میں اس کا ضد اور مخالف ہوسکتا ہے، حالانکہ خدائے تعالی اس سے بری ہے کہ کوئی اس کے ملک میں اس کا ضد ہو سکے۔ یہ سن کر بصری نے کہا: جب تو لوگ مجبور ٹھیر گئے، فرمایا: اگر مجبور ہوں تو معذور ہونا چاہئے، حالانکہ معذور نہیں۔ کہا پھر کیا مختار ہیں۔فرمایا یہ بھی نہیں، کہا: پھر کیا ہیں؟ فرمایا علم الٰہی میں تھا کہ وہ کام کریں گے اس لئے ان میں آلۂ فعل پیدا کیا پھر اگر انہوں نے اس سے کام لیا تو جب تک اس سے وہ کام کرتے رہے ہیں استطاعت سمجھی جائے گی۔ بصری نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ یہی بات حق ہے اور آپ اہل بیت نبوت ورسالت سے ہیں انتہی۔

دیکھئے اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ فعل کو اللہ تعالی ہی پیدا کرتا ہے کیونکہ آپ فرماتے ہیں ’’أن تعمل مالم یکوّن اللہ و أن تنتھی عما کوّن ‘‘اب کہئے کہ اہل سنت نے اگر خدائے تعالی کو خالق افعال بندہ کہا تو کیا برا کہا۔الغرض اس سے ظاہر ہے کہ استطاعت آدمی میں صرف کام کرنے کے وقت ہے کوئی ذاتی قوت نہیں جو قبل وقت تھی، چنانچہ کلینی (ص۹۳) میں ابوعبداللہؑ کا ارشاد مصرح ہے:’’ لیس لہ من الاستطاعۃ قلیل و لا کثیر و لکن مع الفعل و الترک.... کان مستطیعا ‘‘یعنی آدمی کو استطاعت فعل سے پہلے نہ کم ہے نہ زیادہ بلکہ اگر کام کیا تو کرنے کے وقت اور ترک کیا تو

ترک کرنے کے وقت استطاعت سمجھی جائے گی۔

ان تصریحات سے ثابت ہے کہ جس وقت آدمی اچھا یا برا کام کرتا ہے تو وہ کام وہی ہوتا ہے جو خدائے تعالیٰ کی مشیت اور قضا وقدر میں مقرر ہوتا ہے، اس کو حق تعالیٰ آدمی میں پیدا کرتا ہے اور آدمی میں یہ قوت نہیں ہوتی کہ ان کو ترک کر سکے۔ تو اب کہئے کہ وہ اعتراضات جو اہل سنت پر کئے جاتے ہیں وہ صرف اہل سنت ہی پر ہوں گے، یا اہل بیت کرام کے مذہب پر بھی رجوع کریں گے۔

کلینی صفحہ (۸۹) میں یہ روایت بھی ہے۔ ’’عن ابی عبداللہ انه قال اسلکوا بالسعید طریق الاشقیاء حتی یقول الناس ما اشبهه بهم بل هو منهم ثم یتدارکه السعادة و قد یسلک بالشقی طریق السعداء حتی یقول الناس ما اشبهه بل هو منهم ثم یتدارک که الشقاوة ان من کتب الله سعیدا و ان لم یبق من الدنیا الافواق ناقة ختم له بالسعادة‘‘۔ یعنی امام ابوعبداللہؑ فرماتے ہیں پہلے سعیدوں کو شقیوں کا راستہ بھی چلایا جاتا ہے، یہاں تک کہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اشقیاء کے مشابہ ہے بلکہ انہی میں سے ہے مگر آخر کار سعادت اس کو پالیتی ہے۔ اور کبھی شقی کو سعیدوں کا راستہ چلایا جاتا ہے، یہاں تک کہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ سعیدوں کے مشابہ بلکہ انہیں میں سے ہے یہاں تک کہ شقاوت ازلی اسکو پالیتی ہے۔ جس کو خدائے تعالیٰ نے سعید لکھا ہے انجام کار اس کا سعادت ہی پر ہوگا اگرچہ کہ بہت تھوڑا زمانہ باقی رہ جائے انتہی۔

اہل سنت جس کو تقدیر کہتے ہیں اسی کا نام ہے جس کا مفصل حال امام ابوعبداللہ نے بیان فرمایا کہ عمل ظاہری کا کچھ اعتبار نہیں، مدار سعادت وشقاوت کا تقدیر ازلی پر ہے کیوں نہ ہو حق تعالی فرماتا ہے: ﴿ولقد ذرأنا لجهنم كثيرا من الجن و الانس ﴾یعنی بہت سارے آدمی اور جنات کو ہم نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے۔ اب کہئے کہ جس کی تخلیق دوزخ ہی کے لئے ہو تو اس بدنصیب کو خالق افعال ہونے سے کیا نفع۔ رہا یہ کہ خالق افعال خیال کرنے سے اس کو شکایت کا موقعہ نہ ملے گا۔ سو یہ بھی درست نہیں اس لئے کہ جب بھی اعتراض کا موقعہ ہے کہ جب میری تخلیق ہی دوزخ کے لئے تھی تو مجھے خالق افعال ہونے سے نفع ہی کیا ہوا، خصوصاً اس خیال سے اور بھی اعتراض کا موقع مل جائے گا جو کلینی صفحہ (۹۶) میں ہے: ''عن ابی عبداللہ قال ان اللہ اذا اراد بعبد خیرا نکت فی قلبہ نکتۃ من نورو فتح مسامع قلبہ و وکل لہ ملکا یسددہ واذا اراد بعبد سوء نکت فی قلبہ نکتۃ سوداء وسد مسامع قلبہ و وکل بہ شیطانا یضلہ ثم تلاھذہ الایۃ ﴿فمن يرد الله ان يهايه يشرح صدره للاسلام و من يرد ان يضله يجعل صدره ضيقاً حرجاً كانما يصّعّد فى السماء﴾۔

یعنی ابوعبداللہؑ فرماتے ہیں کہ جب خدائے تعالی بندے کی بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے دل میں ایک نکتہ نور کا پیدا کر دیتا ہے اور اس کے دل کی سماعت کو کھول دیتا ہے اور ایک فرشتہ مقرر کرتا ہے کہ اس کو راہ راست پر لگائے رکھے اور جب کسی بندے کی برائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ دھبہ پیدا کر دیتا ہے اور اس کے دل کی سماعت بند کر دیتا ہے اور ایک شیطان اس پر مسلط کر دیتا ہے جو اس کو گمراہ کرتا رہتا ہے پھر

یہ آیت پڑھی جس کا یہ ترجمہ ہے کہ اللہ تعالی جس کی ہدایت کرتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جس کی گمراہی کا رادہ کرتا ہے اس کا سینہ نہایت تنگ کر دیتا ہے، گویا وہ آسمان پر چڑھ رہا ہے۔انتہی ۔دیکھئے جب تک منجانب اللہ شرح صدر نہ ہو آدمی نہ ایمان لا سکتا ہے، نہ عمل صالح کرسکتا ہے۔اب اگر کافر ہی اعتراضات کرے جو اہل سنت پر کئے جاتے ہیں اور حجت پیش کرے کہ میرے دل پر سیاہ دھبہ ہو گیا تھا اور شیاطین مسلط ہو گئے تھے پھر میں کیونکر ایمان لاسکتا تھا؟ اس کا جواب معلوم نہیں اہل عدل کیا دیں گے۔

طینت مؤمن از علیین وطینت کافر از سجین:

کلینی صفحہ (۳۵۸) یہ روایت ہے کہ علی بن حسینؑ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اہل ایمان کے دل طینت علیین سے پیدا کئے اور کافروں کے دل سجین کی کیچڑ سے، اسی وجہ سے مسلمان اس چیز کی طرف مائل ہوتے ہیں۔جس سے وہ پیدا کئے گئے ہیں اور کافر اس چیز کی طرف مائل ہوتے ہیں جس سے وہ پیدا کئے گئے ہیں انتہی ۔جب اصل پیدائش ہی میں یہ اہتمام کیا گیا تو ضرور ہے کہ ’’کل شئی یرجع الی اصلہ‘‘ کے لحاظ سے کافر کبھی علیین کی طرف رجوع نہ کر سکے۔

کلینی صفحہ (۳۵۹) میں یہ روایت ہے کہ صالح بن سہل کہتے ہیں کہ میں نے ابو عبداللہؑ سے پوچھا کہ مسلمانوں کی طینت کس چیز سے پیدا ہوئی۔فرمایا طنیت انبیاء سے، اسی وجہ سے وہ کبھی نجس نہیں ہوتی۔انتہی ۔

طینت مومن نجس نہیں ہوتی:

اب کہئے کہ اگر کفار پوچھیں کہ ہمارا کیا قصور تھا کہ ہماری طینت ناپاک پیدا کی گئی تو بقاعدہ عدل اس کا کیا جواب؟۔

کلینی صفحہ (۳۶۲) میں حبیب بحستانی سے روایت ہے: وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو عبداللہؑ سے سنا، فرماتے تھے کہ جب آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی ذریت نکالی گئی، حکم ہوا کہ ان کو دیکھو، انہوں نے دیکھ کر کہا: الٰہی کس کثرت سے میری ذریت ہے! کس لئے ان کو تو نے پیدا کیا اور ان سے کیا اقرار لینا منظور ہے؟ ارشاد ہوا یہی کہ میری عبادت کریں اور کسی کو میرا شریک نہ قرار دیں اور میرے انبیاء پر ایمان لائیں اور ان کی پیروی کریں، آدم علیہ السلام نے عرض کی: الٰہی میں دیکھ رہا ہوں کہ ان میں بعض بعضو سے بزرگ ہیں اور بعضوں پر نور بہت ہے اور بعضوں پر تھوڑا اور بعض ایسے ہیں کہ ان پر کچھ نور نہیں، ارشاد ہوا: ایسا ہی انہیں پیدا کیا تا کہ ان کی آزمائش ہو، آدم علیہ السلام نے عرض کی الٰہی اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں، ارشاد ہوا کہئے، عرض کی الٰہی اگر سب کو ایک اندازے پر، ایک طبیعت اور ایک رنگ پر پیدا کرتا اور سب کی عمر ایک اور سب کا رزق یکساں ہوتا تو نہ ان میں باہمی بغض وحسد ہوتا نہ اختلاف، ارشاد ہوا: تمہیں ان باتوں کا علم نہیں، میں خالق، علیم ہوں، اپنے علم سے ان کو مختلف طور پر پیدا کیا، میری مشیت اور امر ان میں جاری ہوگا۔ اور میری تدبیر اور تقدیر کے مطابق ان کے حالات ہوں گے میں نے جس طرح پیدا کیا اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، جن وانس کو میں نے صرف عبادت کے لئے پیدا کیا، اور جنت ان لوگوں کے لئے پیدا کی جو میری اطاعت کریں اور انبیاء کے فرمانبردار

ہیں اوراس کی مجھے کچھ پروانہیں، اور جولوگ میری ناشکری اورانبیاء کی نافرمانی کریں ان کے لئے دوزخ پیدا کی، اوراس کی مجھے کچھ پرواہ نہیں، میں نے تم کواور تمہاری اولاد کو جو پیدا کیااس سے میری کوئی حاجت متعلق نہ تھی، صرف تمہاری اوران کی آزمائش مقصود ہے کہ دنیامیں کون اچھے کام کرتا ہے۔اسی واسطے میں نے دنیاوآخرت اورموت وحیات اور اطاعت ومعصیت اور جنت ودوزخ پیدا کئے۔ یہی میں نے اپنی تقدیر وتدبیر میں ارادہ کیا۔اور میرا علم جوان میں نافذ ہے،اس سے ان کی صورتوں، اجسام،الوان،عمر ارزاق، طاعت،اور معصیت میں اختلاف پیدا کیا، کسی کوشقی بنایااور کسی کوسعیداور کسی کو بینا،اور کسی کونابینااور بمناسبت قد دراز قامت،خوبصورت، بدصورت، عالم، جاہل،غنی،فقیر،مطیع، عاصی،صحیح وغیرہ پیدا کیااور آخر میں ارشادہوا: ''**انا اللہ الفعال لما ارید لا اسئل عما افعل و انا اسأل خلقی عماھم فاعلون** ''یعنی میں اللہ ہوں جوچاہتا ہوں کرتا ہوں مجھ سے کوئی پوچھ نہیں سکتااور میں اپنے پیدا کئے ہوؤں سے پوچھوں گا کہ تم نے کیا کام کئے۔انتہی ملخصا۔اب انصاف سے کہئے کہ اہل سنت جومسئلہ عدل میں نشانہ ملامت بنائے جارہے ہیں ان کا کیاقصور؟ اہل بیت کرام بھی تو یہی فرمارہے ہیں۔

کلینی صفحہ(۸۷) میں ابی بصیر سے روایت ہے: وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہؑ سے پوچھا کہ کیا خدائے تعالی نے چاہااور ارادہ کیااور تقدیر میں رکھااور جاری کیا؟ فرمایا: ہاں، پھر پوچھا کیااس کام کو دوست بھی رکھا؟ فرمایانہیں، میں نے کہا یہ کیوں کر ہوسکے کہ جس کام کے لئے ارادہ، تقدیراور قضا ہواور دوست نہ رکھے؟ فرمایا ہم تک تو یہی علم پہونچا

ہے۔انتہی۔

دیکھئے حضرت امام علیہ السلام نے طریقہ بتلا دیا کہ ایسے امور میں چوں و چرا نہ کیا جائے اور وہی اعتقاد رہے جو سلف سے ہم تک پہنچا ہے۔اس معتبر روایت سے ثابت ہوگیا کہ ''منہاج الکرامہ'' اور رسالہ ''فیض عام'' وغیرہ میں جتنے اعتراض اس مسئلہ میں عقلی طور پر پیش کئے گئے ہیں ان کا منشا یہ ہے کہ یا تو ائمہ کے اقوال انہوں نے دیکھے نہیں یا دیکھ کر ان کو نہ مانا بخلاف اہل سنت کے کہ انہوں نے قرآن و حدیث اور اقوال ائمہ کو تسلیم کرلیا۔

کلینی صفحہ (۸۷) میں عبداللہ بن سنان سے روایت ہے: وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہؑ سے سنا ہے فرماتے تھے کہ خدائے تعالی بعض کاموں کا حکم کرتا ہے اور چاہتا نہیں اور بعضوں کو چاہتا ہے اور حکم نہیں کرتا۔ابلیس کو حکم کیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرے مگر چاہا یہ کہ سجدہ نہ کرے، اگر چاہتا تو وہ سجدہ ضرور کرتا۔اور آدم علیہ السلام کو گیہوں کھانے سے منع کیا اور چاہا یہ کہ وہ کھائیں، اگر نہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ کھاتے۔انتہی۔

اس سے ظاہر ہے کہ خدائے تعالی نے دنیا و آخرت کے سارے کام دینے قبضہء قدرت اور اختیار میں رکھے ہیں، اس کی ملک میں کوئی خود مختاری نہیں کرسکتا۔اس سے یہ بات معلوم کرادی گئی کہ کیسی ہی بڑی سے بڑی اور پیاری مخلوق کیوں نہ ہو، خدائے تعالی کے احاطہ قدرت میں وہ ایسی مجبور ہے کہ سوائے وہمی اور خیالی قدرت کے اس کو واقعی قدرت کی بو تک نہیں پہنچی۔اب کس کی مجال ہے کہ خدائے تعالی کے ساتھ شرکت کا دعوی کرسکے۔شرکت کا مدار تو قدرت ہی پر ہے، جس کی وجہ سے تصرف ہوسکے۔پھر اس پر بھی

اگر کوئی قدرت میں کسی کو خدائے تعالیٰ کا شریک قرار دے اور خیال کرے کہ خدائے تعالی نہ بھی چاہے تو آدمی اپنی قدرت اور اختیار سے اپنے کام کرسکتا ہے تو عتاب الٰہی کا سخت اندیشہ ہے۔ اس لئے کہ حق تعالی کو شرکت سے کمال درجے کی نفرت ہے، چنانچہ ارشاد ہے کہ ہر قسم کے گناہ ہم جس کے چاہیں گے بخش دیں گے، مگر شرک کو ہرگز نہ بخشیں گے۔ **کما قال اللہ تعالی ﴿ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذالک لمن یشاء ﴾** اگر ہمیں خدائے تعالی کے کلام اور جزاء وسزا پر ایمان ہے تو ہماری عقل کا مقتضی یہ ہونا چاہئے کہ اپنی بخشائش کی فکر کریں، اور جو کچھ خدائے تعالی نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے اس پر ایمان لائیں، ہمیں اس کی ضرورت نہیں کہ جو اعتراض کفار خدائے تعالی پر کریں گے ان کے جواب کی فکر کریں اور سمجھ میں نہ آئے تو کلام الٰہی پر ایمان لانے سے رک جائیں۔ کافروں کا اعتراض ہے تو خدائے تعالی پر ہے کہ بغیر قدرت دینے کے سزا دینا ظلم ہے۔ اس کا موقعہ ان کی قیامت میں ملے گا، ہمیں کیا ضرور کہ قبل از وقت جواب وہی کے ذمہ دار بن بیٹھیں، جب وہ دوزخ میں جاتے وقت خدائے تعالیٰ پر اعتراض کریں گے تو خدائے تعالی خود ان کو جواب دے کر ساکت کردے گا، چنانچہ قرآن شریف میں ہے **﴿فاعترفوا بذنبھم فسحقا لا صحاب السعیر ﴾** اب ظاہر ہے کہ اعتراض اسی وقت ہوگا کہ دلیل مسکت ان پر قائم ہو جائے گی، چنانچہ ارشاد ہے **﴿فللہ الحجۃ البالغۃ ﴾** غرض ہمیں ان سوال وجواب کے جھگڑوں سے کچھ کام نہیں، ہمارا کام اسی قدر ہے کہ جو کچھ خدا اور رسول ﷺ نے فرمایا ہے پہنچادیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

ارشاد ہے ﴿یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک﴾ اس سے ظاہر ہے کہ صرف پہنچا دینا آپ کا کام تھا، اس سے زیادہ آپ کے ذمہ کوئی کام نہیں، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿لیس لک من الامر شیئی﴾ کلینی صفحہ ۹۵ میں ثابت بن سعید سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ابوعبداللہ نے مجھ سے فرمایا کہ تمہیں لوگوں سے کیا تعلق، کسی کو اپنے مذہب کی طرف نہ بلاؤ خدا کی قسم اگر تم آسمان اور زمین کے لوگ جمع ہو کر چاہیں کہ ایک شخص کو ہدایت کریں جس کی گمراہی کا خدا تعالی نے ارادہ کیا ہو تو اس کو ہدایت کرنا ہرگز ان سے نہ ہو سکے گا۔ اور اگر تم آسمان اور زمین کے لوگ اکٹھے ہو کر ایک شخص کو گمراہ کرنا چاہیں جس کی ہدایت کا ارادہ خدائے تعالی نے کیا ہو اس کا گمراہ کرنا ان سے ہرگز نہ ہو سکے گا۔ اب یہ کوئی نہ کہے کہ یہ میرا چچا یا بھائی یا بھتیجا یا ہمسایہ ہے اگر خدائے تعالی کسی بندے کی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کی روح کو پاکیزہ بناتا ہے کہ اچھی بات سنتے ہی سمجھ جاتا ہے، اور بری بات سے انکار کرتا ہے۔ پھر اس کے دل میں ایک بات ایسی ڈالی جاتی ہے کہ اس کا کام پورا اور مکمل ہو جاتا ہے انتہی۔

شان ولایت اور شان نبوت:

دیکھئے کس وضاحت سے آپ نے فرمایا کہ ہدایت اور ضلالت خدائے تعالی ہی کے ہاتھ ہیں یہاں تک تو فرما دیا کہ لوگوں کو اپنے مذہب کی طرف بلانے کی کوئی ضرورت نہیں جس کو ہدایت ہوگی وہ خود آ جائے گا۔ یہ شان ولایت تھی، چونکہ اولیاء اللہ کی نظر ہمیشہ صفات الہی پر رہا کرتی ہے، اس لئے اکثر ایسے امور میں ان سے مساہلت اور مسامحت ہو

جاتی ہے البتہ شان نبوت یہ ہے کہ احکام الٰہی پر نظر رہے، اسی لئے انبیاء علیہم السلام اور ان کے اتباع ہر وقت دعوت اور تبلیغ میں مصروف رہا کئے۔

کلینی صفحہ ۳۸۶ میں شہاب سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ ابو عبداللہ فرماتے تھے کہ اگر لوگ جان لیں کہ خدائے تعالیٰ نے اس مخلوق کو کیسے پیدا کیا تو پھر کسی پر کوئی ملامت نہ کرے گا۔

کلینی صفحہ ۳٦۸ میں فضیل سے روایت ہے: وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو عبداللہ سے پوچھا کہ حق تعالیٰ جو فرمایا ہے: ﴿اولئک کتب فی قلو بھم الایمان﴾ سو کیا اس میں بندوں کے فعل کو بھی کچھ دخل ہے؟ فرمایا نہیں کلینی میں ابو عبداللہ کا قول نقل کیا ہے:

’’وھب لا ھل المعصیة القوة علی معصیتھم لسبق علمه فیھم و منعھم اطافة القبول منه فو افقوا ماسبق لھم فی علمه و لم یقدر وا ان یاتوا حالاتنجیھم من عذابه لان علمه اولی بحقیقة التصدیق وھو معنی شاء ماشاء وھو سره‘‘۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے اہل معصیت کو معصیت پر قوت دی کیونکہ علم الٰہی میں پیشتر سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی اور روک دیا ان کو حکم الٰہی کے قبول کرنے سے، چنانچہ علم ازلی کے مطابق انکا عمل رہا اور ان کو اس بات پر قدرت ہی نہیں کہ ایسی حالت پیدا کریں جس سے عذاب الٰہی سے نجات حاصل ہو سکے۔ اس لئے کہ علم الٰہی کی تصدیق ہونی بہتر ہے اس سے کہ ان کو اپنی اصلاح کی قدرت ہو اور یہی معنی ’’شاء ماشاء‘‘ کے ہیں یعنی جو چاہا چاہا، اس

میں تغیر نہیں ہوسکتا۔ اور یہ سرالٰہی ہے۔ امام علیہ السلام نے اس ارشاد میں تو اس مسئلہ کا فیصلہ ہی کر دیا کہ اہل معصیت کو قدرت ہی نہیں کہ اپنی حالت میں تغیر پیدا کرسکیں۔

خدائے تعالی خالق خیر وشر ہے:

کلینی میں اس مسئلہ سے متعلق اور بہت سی روایتیں ہیں، ہم نے جو چند روایتیں نقل کیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ خدائے تعالی خالق خیر وشر ہے اور بغیر اس کی مشیت، قدرت، ارادے اور تقدیر کے بندہ اپنی خود مختاری سے کوئی کام نہیں کرسکتا۔ اور جو اس کو اختیار ہے وہ بھی برائے نام ہے، مشیت ازلی میں جو کچھ اس کے لئے ٹھیرا ہے وہ اس کے خلاف سرمونہیں کرسکتا۔

شعیہ کا تراشیدہ فرضی مناظرہ:

رسالہ فیض عام میں لکھا ہے کہ حسینہ ایک لونڈی تھی جو امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں بیس سال رہ کر علوم دینیہ کی تکمیل کی تھی۔ ایک بار ہارون رشید کے دربار میں آکر اس نے دعوی کیا کہ جتنے سنی علمائے بغداد ہیں اپنے مناظرے کیلئے جمع کئے جائیں۔ چنانچہ قاضی ابو یوسف اور شافعی اور ابراہیم بن خالد عونی وغیرہ کل علماء بلوائے گئے اور مناظرہ ہوا۔ بالآخر اس کے مقابلہ میں سب ہار گئے۔ جن مسائل میں مناظرہ ہوا۔ ان میں ایک مسئلہ قضا وقدر اور خلق افعال بھی تھا اس مسئلہ میں حسینہ نے کہا کہ اے ابراہیم تیرا عقیدہ دہریت سے خالی نہیں یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ خود کوئی حکم کر دے اور اس حکم پر راضی نہ ہو، یہ باتیں تمہارے بزرگوں نے اس واسطے بنائیں ہیں کہ ان کے پیشواؤں سے کفر و زندقہ کا

الزام رفع ہو جائے، اے ابراہیم تعجب ہے تمہارے اعتقاد پر کہ شر اور گناہ اور فسق اور کفر سب قضا وقدر اور رضائے خدا سے جانتے ہو۔

خیر وشر قضا وقدر سے ہیں؛ خدا شر سے راضی نہیں:

اس میں خلط مبحث ہے، ابراہیم کا عقیدہ اس نے بھی یہی بیان کیا ہے کہ ''خیر وشر قضا وقدر سے ہے لیکن خدائے تعالی اس سے راضی نہیں'' مگر الزام میں رضائے الٰہی بھی زیادہ کی گی حالانکہ نہ وہ سنیوں کا عقیدہ ہے نہ ائمہ ءاہل بیت کا بلکہ ان تمام حضرات کا عقیدہ یہی ہے کہ خیر وشر قضاء وقدر سے ہیں اور خدا شر سے راضی نہیں اب اگر شر سے قضاء وقدر متعلق ہوتو پیشواؤں پر سے الزام اٹھ جاتا ہے تو خود ائمہ کرام نے اپنے مخالفین سے الزام کو رفع کر دیا، کیونکہ امام جعفر صادق کی تصریح سے ابھی معلوم ہوا کہ خدائے تعالیٰ خالق خیر وشر ہے۔

پھر جب ابراہیم نے آیات قرآنیہ مثل ﴿قل کل من عند اللہ ﴾اور قولہ تعالی ﴿واللہ خالق کل شئی ﴾ وغیرہ پیش کیں تو حسینہ نے جواب دیا کہ ان آیات کی تفسیر اور تاویل میں نے ان بزرگوں سے پڑھی ہے جن کے جد بزرگوار پر قرآن نازل ہوا، یعنی امام جعفر صادق وغیرہ سے۔آپ نے دیکھ لیا کہ حضرت امام جعفر صادق اور دیگر ائمہ کرام کی تصریحات جو کلینی میں موجود ہیں ان سے تو صاف ظاہر ہے کہ آیت ﴿خالق کل شئی ﴾ میں کوئی تاویل نہیں، چنانچہ خدائے تعالی کا خالق خیر وشر ہونا ان حضرات کے کلام میں مصرح ہے اور حسینہ کہتی ہے کہ ''کل'' یہاں بمعنی ''بعض'' کے ہے۔اور حضرات شیعہ کے نزدیک کلینی صحاح میں داخل ہے جس کی حدیث کا انکار نہیں ہوسکتا۔اب کہئے کہ کلینی

کے مقابلہ میں حسینہ کی بات کیوں کر مانی جائے گی پھر حسینہ نے کہا کہ اگر تو اے ابراہیم ﴿قل کل من عند اللہ﴾ کے ظاہر معنی پر حکم کرے تو لازم آتا ہے کہ خالق سب چیزوں کا اللہ تعالیٰ ہی ہو اور یہ مذہب ابلیس کا ہے۔ لیجئے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور دیگر ائمہءکرام کے مذہب کو اس نیک بخت نے ابلیس کا مذہب قرار دیا، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہل بیت کرام کی دشمن تھی پھر اس نے جتنے الزام قائم کئے کہ اگر خالق شر خدائے تعالیٰ ہو تو ظلم اور تکلیف مالا یطاق وغیرہ امور لازم آتے ہیں؟ سو ان کے جوابات کے ذمہ دار صرف اہل سنت ہی نہیں بلکہ اہل بیت کرام سے پوچھنا چاہئے کہ ایسا مذہب آپ نے کیوں اختیار فرمایا۔ ادنے رتأمل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اگر بیس سال وہ امام کی خدمت میں رہی ہوتی تو اس ضروری مسئلہ میں آپ کے اعتقاد پر ضرور مطلع ہوتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کا یہ دعوی بے اصل محض تھا، بلکہ قرائن پر نظر ڈالی جائے تو ادنی تأمل سے معلوم ہوسکتا ہے کہ یہ مناظرہ ہی فرضی ہے اور جن حضرات نے اس کو بنایا وہ اپنے مذہب سے بھی واقف نہیں، کیونکہ اگر واقف ہوتے تو ائمہءکرام کے مذہب کو ابلیس کا مذہب نہ لکھتے۔

یہ بحث ضمناً آ گئی کلام تو اس میں تھا کہ ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ افراط و تفریط ہے۔ قدریہ کی عقلوں نے خدائے تعالیٰ کو ظلم سے بری کرنے کی غرض سے یہ تدبیر نکالی کہ وہ خالق افعال نہیں اور کہدیا کہ عالم کے ایک بڑے حصہ کا خالق نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں دوسرے عقلاء نے کہا کہ مادّے سے سب کام چل جاتے ہیں اس لئے پورے عالم کا بھی خالق نہ ہو تو کیا مضائقہ، چنانچہ مولوی شبلی صاحب نے لکھا ہے جیسا کہ ''مقاصد الاسلام''

کے کسی حصہ میں ہم لکھ چکے ہیں اور چونکہ ان کی کتاب ''الکلام'' نہایت وقعت کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اتباع کی بھی ایک جماعت بن گئی ہوگی۔ خدا کا فضل یہ ہوا کہ مولوی صاحب مسلمانوں پر احسان کر کے اپنا نام قوم مسلمانوں میں لکھواتے ہیں اگر عقل کو اور تھوڑی جولانی دیتے تو تعجب نہیں کہ اس قول کے بھی قائل ہو جاتے جس کو ''الکلام'' (ص۵۲) میں بڑی شدومد سے نقل کرتے ہیں کہ، اگر خدا قادر مطلق ہے تو اس کو دنیا میں صرف نیکی، راست بازی، نیکو کاری پیدا کرنی چاہئے تھی، فریب، جھوٹ، فسق و فجور، حسد بغض، دشمنی انتقام، بے رحمی کے وجود کی کیا ضرورت تھی۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی صاحب ارادہ اور مختار خدا نہیں ہے بلکہ صرف ''لا آف نیچر'' ہے، جس کے موافق کائنات کا ایک سلسلہ قائم ہے''۔ انتہی۔

غرض کہ عقلی دلائل کا سلسلہ یہاں تک پہنچا کہ نعوذ باللہ خدائے تعالی کے وجود کو بھی ماننے کی ضرورت نہ رہی۔

سوفسطائیہ جو حکماء میں ایک فرقہ ہے اس نے دیکھا کہ عقلی دلائل ہر بات پر قائم ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ ضدین کے اثبات پر بھی قائم ہوگئی ہیں۔ اور یہ ممکن نہیں کہ ضدین واقع میں ثابت ہوں اس لئے اس نے کہا کہ عالم ایک بے حقیقت چیز اور خیال ہی خیال ہے، پھر یہاں تک نوبت پہنچی کہ حکماء نے اس خیال والے کو آگ میں ڈالا، جب بھی وہ یہی کہتا رہا کہ یہ بھی ایک خیال ہے۔

جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ایک عقل ایک نئی بات تراشتی ہے اور بہت سے عقلاء اس

کے قائل پیش نظر ہو جاتے ہیں، پھر عقل ایک نئی بات تراشتی ہے اور بہت سے عقلاء اس کے قائل پیش نظر ہو جاتے ہیں، پھر عقل ہی سے بہت سے عقلاء اس کو رد بھی کر دیتے ہیں۔ اور یہ بات قابل تسلیم ہے کہ حکماء جن کو عقل ہی کے کمال نے اس لقب کا مستحق بنایا، ان میں جس قدر اختلاف ہے کسی فرقہ میں نہیں۔ اور انہیں میں ایک فرقہ سوفسطائیہ بھی ہے جس کو عقل ہی نیا اس قابل بنایا کہ خود عقلاء اس کو پاگل اور مجنون سمجھتے ہیں تو کہئے کہ معمولی عقل والے جو ان عقلاء کے کلام کو بھی نہیں سمجھ سکتے ان کی عقلیں کس قطار وشمار میں ہوں گی، اور ہم کس قسم کی عقل کو سلیم اور قابل اعتبار تسلیم کریں غرض کہ کوئی معیار اور پیمانہ نہیں ہے جس سے عقل سلیم کی تعیین کی جائے اس لئے جن لوگوں نے قرآن شریف کو خدا کا کلام مان لیا ہے ان کو بغیر اس کے چارہ نہیں کہ عقل کی پیروی کو چھوڑ کر تمام امور میں خدا اور رسول کے کلام کو مقتدا بنائیں اور جو بات سمجھ میں نہ آئے یا عقل اس میں کوئی خرابی پیدا کرتی ہو تو اس میں اپنی عقل کو متہم کر کے یہ سمجھ جائیں کہ خدا کے کلام پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا ''**فلله الحجة البالغة**'' تا کہ ایمان بالغیب کے مستحق ہوں جس کی تعریف حق تعالی فرماتا ہے اور ہدایت الٰہی اس کی رہبری کرتی ہے دیکھئے حق تعالی فرماتا ہے: ﴿**هدى للمتقين الذين يؤمنون بالغيب**﴾ یعنی قرآن ان لوگوں کیلئے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ اگر عقل کی پیروی کر کے کوئی غیب پر ایمان نہ لائے تو بحسب آیۂ موصوفہ مستحق ہدایت نہ ہوگا۔

علیؓ نے مسئلۂ عدل کو رد کر دیا:

ناسخ التواریخ جلد سوم کتاب الصفین صفحہ (۲۶۳) میں لکھا ہے کہ علی کرم اللہ وجہہ نے جنگ صفین میں ایک بلیغ خطبہ پڑھا جس کے چند فقرات یہ ہیں: ”**الحمد لله الذى لو شاء ما اختلف اثنان من هذه الامة و لامن خلقه ولا تنازعت الامة فى شئى من امره ولا جحد المفضول ذالفضل فضله و قد ساقتنا وهو لاء القوم الأقدار الخ**“۔

یعنی اگر خدائے تعالی چاہتا تو کوئی دو شخص نہ اس امت کے اختلاف کرتے، نہ اور کوئی اس کی مخلوق میں، اور نہ جھگڑا کرتی امت کسی کام میں اور نہ کوئی کم درجہ والا اپنے افضل شخص کی فضیلت کا انکار کرتا ہماری اور ان لوگوں کی تقدیر نے یہاں ہمیں ہانک لایا۔ انتہی۔

اس سے ظاہر ہے کہ مخالفتیں وغیرہ جو ظہور میں آتی ہیں سب تقدیری امور ہیں اور جتنے تقدیری امور ہیں سب کا ظہور ضروری ہے۔ اب کہئے کہ کہاں ہے مسئلہ عدل؟ ناسخ التواریخ جلد سوم صفحہ (۴۵۹) میں لکھا ہے کہ کسی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پوچھا کہ ہم میں اور اہل شام میں جو واقعات گذرے، سب تقدیر سے تھے یا قضاء اور قدر الہی کو اس میں کوئی دخل نہیں؟ فرمایا: ”**والذى خلق الحبة و برى النسمة ما وطئنا ولا هبطنا و اديا ولا علونا تلعة الا بقضاء من الله والقدر**“ یعنی خدا کی قسم ہے کہ جس زمین پر ہمارا گذر ہوا وہ سب صرف قضاء قدر سے تھا۔

اور اس میں لکھا ہے کہ کسی نے قضا و قدر کا مسئلہ امیر المؤمنین علیہ السلام سے پوچھا: فرمایا۔ ”**لاتقولوا: و كلهم الله على انفسهم فتوهنوه ولا تقولوا: جبرهم**

اللہ علی المعاصی فتظلموہ ولکن قولوا: الخیر بتوفیق اللہ والشر بخدلان اللہ و کل سابق فی علم اللہ''۔

یعنی یہ مت کہو کہ خدا نے بندوں کے کاموں کو ان کے اختیار پر چھوڑ دیا کیوں کہ اس میں خدا کی توہین ہے۔ اور یہ بھی نہ کہو کہ اپنے بندوں کو گناہوں پر مجبور کیا کیونکہ اس سے خدا کی طرف ظلم کی نسبت ہوتی ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ اچھے کام خدا کی توفیق سے اور بری کام اس کے خذلان سے ہوتے ہیں اور سب خدا کے علم میں پہلے سے موجود ہیں انتہی۔

دیکھئے اس میں صاف ارشاد ہے کہ اگر بندہ مختار قرار دیا جائے تو خدائے تعالی کو توہین ہوگی کیونکہ اس کی خالقیت میں وہ اس کا ہمسر بنا دیا گیا۔

اوراسی کے صفحہ (۹۸۴) میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے۔

''**کلما زاد عقل الرجل قوی ایمانہ بالقدر** ''یعنی جس قدر آدمی کی عقل زیادہ ہوگی قضا اور قدر پر اس کا ایمان قوی ہوگا۔ مطلب یہ کہ جتنے اعتراض مسئلہ قضا و قدر پر ہوتے ہیں ان کا منشاء کم فہمی ہے جس کی عقل کامل ہو اس کو اس مسئلہ کا پورا یقین ہے۔

نہج البلاغۃ جلد اول صفحہ (۷۶) میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول نقل کیا ہے:

''**انما صدرت الامور عن مشیئہ** ''یعنی جتنے امور صادر ہوئے سب خدائے تعالی کی مشیت سے ہوئے۔ اوراس میں لکھا ہے: **وسئل عن القدر فقال طریق مظلم فلا تسلکوہ و بحر عمیق فلا تلجوہ و سر اللہ فلا تتکلفوہ** ''۔ یعنی کسی نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے مسئلہ قدر کا حال پوچھا: فرمایا، وہ ایک اندھیری راہ

ہے۔اس میں قدم مت رکھواور بحرعمیق ہے اس میں مت گرواور وہ خدائے تعالی کا سِرّ ہے اس کے سمجھنے کی تکلیف مت اٹھاؤ انتہی ۔

مطلب یہ کہ ہر شخص اس کو سمجھ نہیں سکتا اور نافہمی سے اعتراض پیدا کرتا ہے، اس لئے اس میں غور وفکر ہی نہ کرو۔

سبحان اللہ ! کیا سچا ارشاد ہے، جن لوگوں نے اس ارشاد کو پیش نظر نہ رکھا وہ ایسے بہک گئے کہ راہ گم کردی اور ایسے ڈوبے کہ پھر نکل نہ سکے۔ چنانچہ ’’منھاج الکرامۃ‘‘ میں سینوں پر بہت سے اعتراض کردیئے کہ وہ قضاء وقدر کے قائل ہیں جس سے لازم آتا ہے کہ خدا بڑا ظالم ہے، کہ لوگوں کو تکلیف مالا یطاق دیتا ہے اور انبیاء کا بھیجنا بھی فضول ثابت ہوتا ہے اور اس پر ایک حکایت بھی لکھدی کہ ابوحنیفہؒ نے امام کاظمؒ سے ان کے لڑکپن کے زمانہ میں پوچھا کہ معصیت کس سے ہے؟ فرمایا کہ اگر خدا کی طرف سے ہو تو دعدل کے خلاف ہے اور خدا اور بندہ دونوں کی طرف سے ہو تو بندہ خدا کا شریک ٹھیرا، اس سے ثابت ہے کہ وہ فقط بندے ہی کا فعل ہے جس سے وہ مستحق ثواب وعقاب ہوسکتا ہے۔ ابو حنیفہؒ نے اس پر آپ کی تعریف میں کہا ’’ذریة بعضها من بعض‘‘ انتہی ۔

دیکھئے علی کرم اللہ وجہہ کے ارشاد سے صراحۃً ثابت ہے کہ بندہ مختار سمجھا جائے تو خدائے تعالی کی توہین ہوگی تو کیا باوجود اس ارشاد کے ائمہء اطہار کا معتقد یہ خیال کرسکتا ہے کہ حضرت امام کاظم رحمۃ اللہ علیہ نے خدائے تعالی کی توہین نعوذ باللہ کی ہوگی۔ یا لڑکپن میں آپ کو اس توہین کا الہام ہوا ہوگا۔ اگر یہ الہام تسلیم کیا جائے تو علی کرم اللہ وجہہ کی نسبت

کیا کہا جائے؟ غرضکہ ان روایات کے دیکھنے کے بعد ہم یقیناً کہہ سکتے ہیں کہ مسئلہ عدل میں جس قدر روایتیں حضرات شیعہ نقل کرتے ہیں وہ موضوع ہیں۔ اور جتنے عقلی اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ارشاد سے ثابت ہے کہ منشاء ان کا کم فہمی ہے اگر عقل کامل ہو تو کوئی اعتراض خیال میں نہ آئے۔

بندہ کاسب اعمال ہے، خالق یا مجبور نہیں:

غرضکہ قدریہ بندے کو فاعلِ مختار اور اپنے افعال کا خالق کہتے ہیں۔ اور جبریہ کہتے ہیں کہ بندہ مجبورِ محض ہے جس طرح لکڑی، پتھر کو قدرت نہیں اسی طرح بندے کو بھی قدرت نہیں۔ اہل سنت والجماعت نے دیکھا کہ بندے کو عمل کرنے کا حکم، اور جزا و سزا اعمال کا نتیجہ ہے اور بیسیوں آیتوں اور احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ خدائے تعالی تمام اشیاء کا خالق ہے اس لئے وہ دونوں نصوص کی قسم پر ایمان لا کر اس بات کے قائل ہو گئے کہ بندہ کا سب اعمال ہے خالق نہیں، چنانچہ ان کے ہاں یہ قول مشہور ہے ''لا جبر و لا قدر و لکن الامر بین بین'' جیسا کہ علی کرم اللہ وجہہ کے ارشاد سے بھی یہی ثابت ہے۔

مذہب اہل سنت افراط تفریط سے بری ہے:

ان کے مذہب کا ماحصل یہ ہے کہ جس کے اعضاء صحیح و سالم ہوں اور اس کا ارادہ کسی فعل کے ساتھ متعلق ہو جائے تو اس فعل کو خدا تعالی اس میں پیدا کرتا ہے خواہ وہ اس سے راضی ہو یا نہ ہو کیونکہ ارشاد ہے: ﴿کلا نمد ھولاء و ھولاء من عطاء ربک و ما کان عطاء ربک محظورا﴾ یعنی اچھے برے سب کو ہم مدد دیتے ہیں، عطاء الٰہی

کو کوئی روک نہیں غرض کہ مذہب اہل سنت متوسط اور افراط و تفریط سے بری ہے۔شیعہ اور مجسمہ ائمہ ءاطہار کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ ان کو مثل انبیاء علیہم السلام کے معصوم سمجھتے ہیں، بلکہ بعض اس سے بھی ترقی کر کے قائل ہو گئے کہ حق تعالیٰ ان میں حلول کیا تھا، جیسا کہ شرح مواقف صفحہ (۲۵) میں ہے۔اور خوارج نے ان کی توہین میں یہاں تک غلو کیا کہ تکفیر کرنے لگے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت سے خارج کر دیا۔نعوذ باللہ من ذلک اہل سنت باتباع قرآن وحدیث ان حضرات کے درجے کو انبیاء کے درجے سے کم اور غیر معصوم سمجھتے ہیں۔لیکن سادات کرام اور واجب الاحترام جانتے ہیں۔غرضکہ ''خیر الامور اوسطھا'' انہی کے مذہب پر صادق آتا ہے۔

الحاصل ادنیٰ تأمل سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ ابن سبا کو منظور تھا کہ مسلمانوں میں مخالفت قائم کرے اور علی کرم اللہ وجہہ اور اہل بیت کرام کی محبت کو دام تزویر بنائے تو اس کو یہ ضرورت ہوئی کہ خلفائے ثلثہ کی توہین کرے اور احادیث و واقعات تراشے اور دیکھا کہ تمام صحابہ بلکہ خود علی کرم اللہ وجہہ نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی تو علی کرم اللہ وجہہ کی طرف تو تقیہ کی نسبت کی اور کل صحابہ کی تکفیر ہی کر دی اور اسی کے مناسب روایتیں تراشیں۔اور خوارج چونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دشمن تھے اس لئے ان کے مقابلہ میں انہوں نے بھی اپنے مفید مدعا حدیثیں اور واقعات تراش لئے۔اور طرفین سے خوب سب وشتم ہوئی اور ہو رہی ہے اہل سنت والجماعت کو چونکہ طرفین سے اعتقاد ہے اور کل صحابہ کے ممنونِ احسان ہیں، اس لئے کہ دین جو ہم تک پہنچا ان ہی حضرات کے واسطے سے پہونچا

اس لئے نہ صحابہ کی تکفیر کی انہیں ضرورت ہوئی نہ خلفائے راشدین کی توہین کی۔ اسی وجہ سے ان حضرات کی فصیلت میں جتنی حدیثیں وارد ہیں ان کونہایت شوق سے نقل کرتے ہیں اور جو جو خصوصیتیں ہر صحابی کی احادیث میں وارد ہیں ان کو بصدق دل قبول کرتے ہیں ﴿ذلک فضل الله یؤتیه من یشاء﴾۔

مصادر و مراجع

کتاب	مصنف	سنہ ولادت	سنہ وفات



ا۔احیاء العلوم	حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد بن احمد الطوسی الغزالی	۴۵۰ھ	۵۰۵ھ
۲۔الاکلیل	ابو محمد حسن بن احمد بن یعقوب ہمدانی		۳۳۴ھ
۳۔بحار الانوار	محمد باقر بن محمد تقی المجلسی الاصفہانی الشیعی	۱۰۳۷ھ	۱۱۱۱ھ
۴۔تاریخ اسلام	شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد ذہبی	۶۷۳ھ	۷۴۸ھ
۵۔تاریخ الخلفاء	جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی	۸۴۹ھ	۹۱۱ھ
۶۔تاریخ دول اسلامیہ	احمد بن زینی دحلان مکی، مدنی شافعی	۱۲۳۱ھ	۱۳۰۴ھ
۷۔تاریخ کامل	ابو الحسن علی بن محمد بن محمد ابن اثیر	۵۵۵ھ	۶۳۰ھ
۸۔تدریب الراوی	السیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن شافعی	۸۴۹ھ	۹۱۱ھ
۹۔تفسیر ابن جریر	ابو جعفر محمد بن جریر طبری شافعی		۳۱۰ھ
۱۰۔تلبیس ابلیس	جمال الدین ابو الفرج عبدالرحمٰن ابن الجوزی	۵۱۰ھ	۵۹۷ھ
۱۱۔تمہید ابو شکور سالمی	ابو شکور محمد بن عبدالسید الکشی السالمی الحنفی		
۱۲۔تہذیب التہذیب	شہاب الدین احمد بن علی بن محمد ابن حجر عسقلانی	۷۷۳ھ	۸۵۲ھ
۱۳۔الجامع الصغیر	ابو الفضل جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی	۸۴۹ھ	۹۱۱ھ
۱۴۔حلیۃ الاولیاء	شہاب الدین احمد بن علی بن محمد ابن حجر عسقلانی	۷۷۳ھ	۸۵۲ھ
۱۵۔خصائص کبری	جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر السیوطی	۸۴۹ھ	۹۱۱ھ
۱۶۔دبستان مذاہب	مؤبد شاہ المبتدی		
۱۷۔رسالہ فیص عام	میر عنایت حسین		
۱۸۔شرح مواقف	سید شریف علی بن محمد جرجانی حنفی		۸۱۶ھ

کتاب	مصنف	سنہ ولادت	سنہ وفات



		حصہ	ستشم
۲۰۔صحیح بخاری شریف	ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بخاری	۱۹۴ھ	۲۵۶ھ
۲۱۔صحیح مسلم شریف	ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری	۲۰۶ھ	۲۶۱ھ
۲۲۔صواعق محرقہ	شہاب الدین احمد بن محمد ابن حجر مکی لہیتمی	۹۰۹ھ	۹۷۳ھ
۲۳۔طبقات شعرانی	عبدالوہاب بن احمد الشعرانی الشاذلی	۸۹۸ھ	۹۷۶ھ
۲۴۔فتوحات مکیہ	ابن عربی، محی الدین محمد بن علی الطائی المالکی	۵۶۰ھ	۶۳۸ھ
۲۵۔الکافی للکلینی	کلینی، ابوجعفر محمد بن یعقوب شیعی		۳۲۹ھ
۲۶۔کتاب السیر	احمد بن سعید خارجی شماخی اباضی		۹۲۸ھ
۲۷۔کنز العمال	علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین حنفی	۸۸۵ھ	۹۷۵ھ
۲۸۔لسان العرب	جمال الدین ابوالفضل محمد بن مکرم الانصاری		۷۱۱ھ
۲۹۔مشکوۃ المصابیح	ولی الدین محمد بن عبداللہ خطیب تبریزی		۷۴۱ھ
۳۰۔ملل ونحل	ابوالفتح محمد بن عبدالکریم بن احمد شہرستانی	۴۶۷ھ	۵۴۸ھ
۳۱۔ملل ونحل	ابن حزم، ابومحمد علی بن احمد ظاہری		۴۵۶ھ
۳۲۔منتھی الارب	عبدالرحیم بن عبدالکریم ہندی		۱۲۵۷ھ
۳۳۔منہاج السنۃ النبویۃ	تقی الدین احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہ حنبلی	۶۶۱ھ	۷۲۸ھ
۳۴۔منہاج الکرامۃ	شبلی نعمانی صاحب	۱۲۷۴ھ	۱۳۳۲ھ
۳۵۔مواقف	قاضی عضد الدین عبدالرحمٰن بن احمد ایجی		۷۵۶ھ
۳۶۔میزان الاعتدال	ذہبی، ابوعبداللہ محمد بن احمد دمشقی شافعی	۶۷۳ھ	۷۴۸ھ
۳۷۔ناسخ التواریخ	مرزا محمد تقی مستوفی کاشانی		۱۲۹۷ھ
۳۸۔نہج البلاغہ	الشریف رضی الدین محمد بن حسین المرتضی	۳۵۹ھ	۴۰۶ھ